اردو شاعری کی گیارہ آوازیں

عبدالقوی دسنوی

نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

اُردو شاعری کی گیارہ آوازیں

عبدالقوی دسنوی

نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار :

صدر دفتر :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

پہلی بار دسمبر: ۱۹۹۳ء تعداد 500 قیمت =/75

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

رفیقہ حیات

نجم النساء دسنوی

کے نام

فہرست

پیش لفظ

شعرائے اردو سے متعلق یہ گیارہ مضامین، میں نے مختلف وقتوں میں مختلف ضرورتوں کے تحت لکھے ہیں۔ یہ تمام شعراء مجھے کسی نہ کسی طرح پسند رہے ہیں، ان میں سے چند شعراء ایسے ہیں جنھوں نے مجھے متاثر کیا ہے۔ بسا اوقات اس جہان آب و گل جسکی خالق کائنات نے جس غرض سے بھی تخلیق کی ہو، انسانی ذہن کی پستی نے جہنم زار بنا دینے میں کامیابی حاصل کی ہے، کبھی اجتماعی طور پر، کبھی انفرادی صورت میں، ایسے موقعوں پر جس بے دلی اور پست ہمتی کا میں شکار ہوتا رہا ہوں ان سے اگر میں نہ نکل سکتا تو خود میری زندگی میرے لیے عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ان میں سے اکثر شعراء نے ان حالات میں میری رہنمائی کی ہے۔ ان سے نکلنے کی طاقت دی ہے اور ان سے نپٹنے کی ہمت عطا کی ہے۔ اِسی سبب یہ شعراء مجھے عزیز رہے ہیں۔

یہ شعراء مختلف وقتوں میں مختلف مقامات سے اپنی آواز بلند کرتے رہے ہیں اور اپنے جذبات و افکار سے باخبر کرتے رہے ہیں اور اپنی اپنی آوازیں اپنی پہچان کراتے رہے ہیں۔ یہاں میں نے اپنے طور پر انھیں پہچاننے کی کوشش کی ہے۔

۲ پرنس کالونی

نعمت پورہ، عیدگاہ ہلز

بھوپال - ۴۶۲۰۰۱

عبدالقوی دسنوی

اکبر الٰہ آبادی کا زمانہ، فن

اور اُن کی غزل گوئی کا اوّلین دور

اردو کے وہ شعراء جو ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور فرنگیوں کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے برے نتائج اور خراب اثرات اور سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، تعلیمی اور فکری ردِّ عمل سے متاثر، متفکر اور مضطرب ہو کر سامنے آئے، اُن میں حالی، اکبر اور اقبال کے نام نہایت احترام سے لیے جاتے ہیں، یہ تینوں شعراء اردو شعر و شاعری کے گلشن میں غزل خوانی کرتے ہوئے داخل ہوئے اور وقت کی ضرورت، حالات کے تقاضے مذہبی فرائض، ملکی ذمہ داریوں، اور انسانی ضرورتوں کے پیش نظر، غزل کے ساتھ دوسری اصناف کو بھی نہ صرف اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مخصوص کیے بلکہ انھیں اصناف میں اپنے بہترین جوہر دکھائے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام لوگوں کے ذہن و دماغ سے ان کی غزلیں اوجھل ہونے لگیں اور ان کے اثرات کم ہونے لگے اور پھر یہ نظم گو کی حیثیت سے زیادہ جانے پہچانے اور شہرت پانے لگے۔ حالانکہ اِن حضرات کی غزلیں اردو غزلیات میں اپنا منفرد مقام اور اپنی مخصوص شناخت رکھتی ہیں۔

اِن تینوں یعنی حالی، اکبر اور اقبال میں پہلے دو کی پیدائش پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) سے پہلے ہوئی تھی اور اقبال کی بعد میں، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس تاریخی سنہ سے بیس سال پہلے حالی پیدا ہوئے اور سولہ سال بعد اقبال، تو یہ بات کہنے میں زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اکبر الٰہ آبادی کی پیدائش نومبر ۱۸۴۶ء یعنی اس تاریخی حادثہ سے تقریباً گیارہ سال قبل ہوئی تھی۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی عین عالم شباب میں اس عظیم حادثہ سے دوچار

ہوئے اور بے انتہا اضطراب اور انتشار میں گرفتار رہے، اور پھر:

ہو چکے حالیؔ غزل خوانی کے دن

کا فیصلہ سناتے ہوئے، کبھی حالات سے باخبر کرتے ہوئے، کبھی پند و نصائح کے ذریعے قوم کے اصلاحی کاموں میں مصروف ہو گئے اور "سعدیِ ہند" بن کر چکے، ابھرے اور ڈوبے۔

اقبال نے جب ہوش سنبھالا تو اس حادثۂ جانکاہ کے ظاہری نشانات مٹنے لگے تھے، خون کے دھبے ہلکے پڑنے لگے تھے، تھمتے تھمتے آنسو تھمنے لگے تھے، انگریزوں کے خلاف شدید نفرت اور غیظ و غضب کے جذبات میں ٹھہراؤ پیدا ہونے لگا تھا، پھر ہندوستانیوں نے ذرا اطمینان نصیب ہونے پر، اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا تو انھیں محسوس ہوا کہ یہاں وہ زمین نہیں رہی، وہ آسمان نہیں رہا، ہوائیں سمت بدل چکی تھیں، فضائیں رنگ تبدیل کر چکی تھیں، احساسات پژمردہ ہو رہے تھے، امیدیں چھوٹ رہی تھیں، مایوسیاں اپنا ڈیرا جما رہی تھیں، پژمردہ نے مغرب کے گرد اگرد جمع کر دینے شروع کر دیے تھے، البتہ ایک حسّاس دل، ہمدردِ ملّت، صلح کل کا بیا میر، رہنمائی میں خضرِ والیاس — حق گوئی و بے باکی کی آواز، فضا میں بلند کر رہا تھا اور ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کے لیے ہر ممکن سعی کے لیے تیار تھا۔ میری مراد سرسید احمد خاں سے ہے، جن کے ساتھ حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد، اکبر الہ آبادی، محسن الملک، وقار الملک، ہاتھ پاؤں مارتے نظر آ رہے تھے۔ اقبال نے اُن سے فیض اٹھایا اور غزل اور نظم دونوں اصناف کو اپنی جولان گاہ قرار دیا اور خوب خوب جوہر دکھایا۔

اکبر الہ آبادی گو سرسید کے کاموں کے معترف تھے لیکن ان کے تعلیمی نظریہ سے کسی طرح متفق نہیں ہوئے کہ ان کے خیال میں وہ راستہ جو سرسید نے اپنایا تھا وہ ہندستانیوں کو مغربی رنگ میں پوری طرح رنگ تو سکتا تھا لیکن ان کے لیے اس قدر مفید نہیں بن سکتا تھا، جس کی اس وقت ضرورت تھی، چنانچہ انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بعض دوسری سیاسی و سماجی مسائل کے علاوہ مغرب، مغربی تہذیب، مغربی تعلیم، مغربی اندازِ فکر، مغربی طریقۂ زندگی اور

مغرب پرستی کو بنایا اور ان کے خلاف نہایت تیز، تلخ اور مسلسل آواز بلند کرتے رہے اسی کے ساتھ سرسید[1] اور اسی کے ہمنواؤں کا مذاق بھی اڑاتے رہے اور ان کے لیے تضحیک آمیز لہجہ بھی اختیار کرتے رہے:

دلا دے ہم کو بھی صاحب کی لائبریری پروانہ
رہے لاکھوں برس سید ترے آنر کا افسانہ

یا اُن کی مغربی تعلیم سے دلچسپی کے خلاف آواز بلند کی:

ہوتی تھی تائید لندن جاؤ، انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع وتراش
لیڈیوں میں مل کے دیکھو ان کے انداز طریق
ہال میں ناچو، کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش
بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش

اور پھر، سرسید کے ساتھ اکبرالہ آبادی، علی گڑھ کالج اور اس کے طلبہ میں کیڑے نکالتے رہے اور اپنے جذبہ ملامت کو تسکین پہنچاتے رہے اس کے ساتھ، اُن اہم پہلوؤں اور موضوعات کو بھی اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں انھوں نے جگہ دی جن کو وہ اپنے لیے، اپنی ملت کے لیے اور اپنے وطن کے لیے ضرر رساں تصور کرتے تھے اور ہندستانیوں میں جو مختلف خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں یعنی بے عملی، بے حسی مذہبی جھگڑے، عورتوں کی بے پردگی اور آزادی، مغرب زدگی

---

[1] حالانکہ سرسید کی خدمات کا اعتراف بھی کرتے تھے:

سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنائے مدرسہ لے کہ خدا کا نام
صدمے اٹھائے، رنج سہے گالیاں سہیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانے کو زور دل و دماغ
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بصد شان و احترام

(کلیات اکبر حصہ اول ــــ ص ۲۹۹)

اور دوسری بہت ساری چھوٹی بڑی برائیاں اور بداعمالیاں جنھیں وہ نقصان کا باعث سمجھتے تھے ان پر بھی تیز اور تیکھے حملے کیے، وہ سیاست پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور موقع موقع سے اس کی خرابیوں کی طرف بھی اشارہ کرتے تھے۔ اپنے مقصد کو بروئے کار لانے اور عوام کو آسانی سے سمجھانے کے لیے انھوں نے منظوم واقعات اور لطائف کی بھی مدد لی۔ منظوم قصّوں سے بھی کام لیا ہے تاکہ سننے اور پڑھنے میں دلچسپی پیدا ہو اور بات بات میں ان کی بات عوام تک پہنچ جائے اور وہ شیشہ بازانِ فرنگ کی حقیقتوں سے آگاہ ہو جائیں اور اپنی مشرقیت کی حفاظت کی فکر کریں۔

اکبرالٰہ آبادی نے اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کو زیادہ شگفتہ اور زہرناک بنانے اور اثر وتاثیر سے بھرپور کرنے کے لیے کبھی ہندی کے الفاظ دھن، دُھرا، دنگل، مہراج، سبھا، پرچاتے، تیجا، گروجی، چیلا، للّو پتّو وغیرہ برجستہ اور برمحل استعمال کیے ہیں، اور مطالب کو پیش کرنے اور مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور کبھی انگریزی کے الفاظ اس روانی اور خوبی سے استعمال کر گئے ہیں کہ پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اُن الفاظ کے بغیر وہ باتیں جو اکبر کہنا چاہتے تھے اور وہ اسلوب جو وہ اختیار کرنا چاہتے تھے نہ کبھی کہہ سکتے تھے نہ کبھی اختیار کر سکتے تھے، وہ انگریزی کے عام فہم الفاظ کے پردے ہی مسکرانے اور ہنسنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں اور ان کی چبھن سے تلملا بھی دیتے تھے اور مضطرب بھی کر دیتے تھے۔ انگریزی کے ایسے الفاظ جو انھوں نے بار بار یا کبھی کبھار استعمال کیے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:

بس، پریس، اسپیچ، انجن، میم، ایم، فیم، کیمپ، پمپ، لمپ، جمپ، پائپ، ٹائپ، سالویشن، سلف، رسکٹ، میٹر، میس، ڈیل مولوی، کیک، گڈبائی وغیرہ انگریزی کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو اکبر کے یہاں اپنی سنجیدگی کھو کر مضحک بن گئے ہیں اور آج بھی ہنسنے، تڑپنے اور مضطرب ہونے پر مجبور کرتے ہیں،

اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اکبر نے اپنی شاعری میں بہت سے حقیقی اور فرضی نام بھی استعمال کیے ہیں اور وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ ستیہ، والمیک، بھائی

مانک، لالہ نہال چند، انور، اکبر کے علاوہ بدھو، جمن، صلّو، وفاتی، زید و بکر کے نام بھی استعمال کر کے خاص طور سے مسلمانوں کی مفلوک الحالی، بے حسی، بے بسی سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے، اُن کی مدد سے اپنی بات کہنے اور سمجھانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندی، انگریزی کے الفاظ اور اُن فرضی ناموں کو اپنی طنزیہ، مزاحیہ شاعری میں جس طرح انھوں نے استعمال کیے ہیں اور اُن سے جو معنی و مفاہیم پیدا کیے ہیں اور تاثر چھوڑے ہیں وہ اکبر کا حصّہ ہیں۔ چنانچہ اردو شاعری میں طنز و مزاح کے جس اسلوب کو اکبر نے اختیار کیا اور جس لطیف طنز اور پاکیزہ مزاح سے ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے اس کا نہ کوئی حقدار بن سکا نہ وارث ٹھہر سکا۔ انھیں سے اس کی ابتداء ہوئی اور انھیں پر اس کا اختتام ہوا۔

لیکن مسکرا کر، ہنسا کر، رلانے والے، تڑپانے والے اور مضطرب اور بے چین کرنے والے اکبر الہ آبادی جو اپنی آواز میں منفرد، اسلوب میں بے مثل، جب بچپنے کے سفر کو طے کر کے عنفوان شباب میں داخل ہوتے ہیں اور دنیائے ادب میں غزل خوانی کرتے ہوئے اپنی شاعری کی پہلی منزل طے کرتے ہیں یا پہلے دور کو اختتام تک پہنچاتے ہیں، تو وہ صرف روایتی غزل گو کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتے۔ حالانکہ طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں جو انھوں نے بلند مقام حاصل کیا تھا وہ ان کی فطری صلاحیت کا نتیجہ تھا وہ اس میدان میں خود ہی آگے بڑھے، انھوں نے خود ہی تجربے کیے اور خود ہی نتائج تک پہنچے اور خود ہی ان کا اعلان کرتے رہے لیکن جب اُردو کی اس بڑے شاعر کی ابتدائی دور کی شاعری کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو سوائے پرانے طرز اور قدیم رنگ کی غزلوں کے ان کے یہاں اور کوئی نئی آواز نہیں سنائی دیتی اور نہ نیا لہجہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ دور ۱۸۶۲ء[1] سے ۱۸۷۶ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد ان کا تعلق "اودھ پنچ" سے ہو جاتا ہے اور اُن کی ادبی اور فکری زندگی میں نیا موڑ آتا ہے گویا اس طرح اکبر کی شاعری کا پہلا دور

---

[1] ڈاکٹر صغرا مہدی نے پہلا دور ۱۸۶۲ء – ۱۸۷۶ء تک کے زمانے کو قرار دیا ہے مجھے ان سے اتفاق ہے۔ دسنوی

ان کی سولہ[16] سال کی عمر سے شروع ہو کر تیس سال کی پختہ عمر پر ختم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے گیارہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی لیکن سولہ[16] سال کی عمر یعنی ۱۸۶۲ء سے پہلے کا کلام دستیاب نہیں ہے اس لیے اسے موضوعِ بحث بنانا لاحاصل ہے۔

اس دورِ اوّل کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اس میں عام طور سے قدیم طرز کی غزل گوئی کا چرچا تھا اور اکبر اس سے گریز کرنے پر قادر نہ تھے اس لیے کہ انھیں کہیں سے نئی روشنی نہیں مل رہی تھی۔ وحیدالدین[2] احمد خاں وحیدالہ آبادی جو آتش کے تلامذہ میں سے تھے اکبرالہ آبادی کے پہلے اور آخری استاد تھے۔ چند غزلیں انھیں دکھائیں پھر یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا، سبب نہیں معلوم اور کسی اور کے پاس جا کر کلام پر اصلاح لینے کی ضرورت انھوں نے محسوس نہیں کی۔ بس قدیم طرز کی غزلیں کہتے رہے جن میں غمِ جاناں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے لیکن وہی روایتی عشق محبوب کے ناز و انداز اور غمزے میں یکسانیت، عاشق کا وہی انتظار، اضطراب، آزمایش اور پیچ و تاب، وہی فرسودہ تراکیب، وہی الفاظ کا استعمال یعنی ناصح شیخ، عدو، دوست، جام صہبا، کعبہ، بت خانہ، صنم اغیار، ہجر و وصال وغیرہ کے علاوہ آبِ حیوان بادۂ گل رنگ، وعدۂ فردا، لب جاں بخش، نقد دل، روزِ محشر، مآلِ ہستی، تیغ نگہہ، چشمِ جاناں، قدرعنا، زلف پیچاں، دلِ نالاں وغیرہ بہت بڑی تعداد میں ملتے

---

[2] وحیدالدین احمد خاں کا نام مختلف کتابوں میں اس طرح ہے:

(۱) وحیدالدین احمد وحید تخلص۔ انتخاب وحید۔ انجمن ترقی اردو ہند

(۲) وحیدالدین احمد خاں وحیدالہ آبادی۔ وحیدالہ آبادی: نثار احمد فاروقی: آجکل دہلی مارچ ۱۹۵۷ء ص ۵۲

(۳) وحیدالدین محمد وحید۔ وصیت نامہ۔ مقدمہ از سید علی حسنین زیبا: انتخاب وحید انجمن ترقی اردو ہند

(۴) منشی غلام حسین۔ ضمخانۂ جاوید لالہ سری رام

(۵) غلام حسین وحید۔ بیاض سخن مرتبہ عبدالشکور رشید ادیکھیے وحیدالہ بادی از نثار احمد فاروقی

(۶) غلام حسین وحید۔ تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ مطبوعہ ۱۹۵۴ (چوتھی بار) ص ۴۲۰

ہیں، اُن ہی سے اُن کی غزل کا مزاج اور آہنگ بنتا اور سنورتا ہے اور ان کی غزل گوئی کی پہچان اور خود ان کی شناخت میں آسانی ہوتی رہی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جانبِ زنجیر گیسو پھر کھنچا جاتا ہے دل　　دیکھیے اب میرے سر پر کیا بلا لاتا ہے دل
رکھ کے تصویرِ خیالی یار کی پیشِ نظر　　رات بھر مجھ کو شبِ فرقت میں تڑپاتا ہے دل

شوقِ نظارہ کبھی دل سے نکلتا ہی نہیں　　جی ہمارا بے ترے دیکھے بہلتا ہی نہیں

میں حالِ دل تمام شب ان سے کہا کیا　　ہنگامِ صبح کہنے لگے کس ادا سے "کیا؟"

اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اس دور میں ان کے یہاں الگ رنگ و آہنگ میں ڈوبے ہوئے اشعار بھی ملتے ہیں جو حقیقت سے کسی قدر قریب زندگی کی ایک خاص کیفیت کو پیش کرنے اور معاشرتی اور تہذیبی حالات کی ترجمانی میں کامیاب نظر آتے ہیں، ان کے مطالعہ سے تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے لیکن ایسے اشعار کی تعداد کم ہے:

میلے میں حسینوں کے پریزادوں کے جمگھٹ　　اب جا کے قیام اپنا لب گنگ کریں گے
خاطر تو تم نے آج بہت کی مگر حضور　　کل پھر یہی نگاہ یہی گفتگو رہے
غریب خانہ میں للہ دو گھڑی بیٹھو　　بہت دنوں میں تم آئے ہو اس گلی کی طرف
جو گھر میں پوچھے کوئی، خوف کیا ہے کہہ دینا　　چلے گئے تھے ٹہلتے ہوئے کسی کی طرف

اسی دور میں اکبر الہ آبادی کے یہاں اچھے خاصے اشعار ایسے بھی مل جاتے ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی کم مائیگی کا احساس بھی ابھرتا ہے اور طرح طرح کے حادثات اور واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے مواقع بھی ملتے ہیں ایسے اشعار کہنے کا حق انھیں لوگوں کو ہوتا ہے جو اس طرح کے حالات سے گزرتے ہیں اور ان کے نتائج پر غور و فکر کرتے ہیں اور کسی خاص نکتے پر پہنچتے ہیں۔ اکبر نے اس سلسلے میں اچھی کوشش کی۔ چنانچہ وہ صداقتوں سے گزر کر کبھی کبھی معرفت کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ وہ فکر کی بہت زیادہ گہرائی

تک نہیں پہنچ سکے ہیں، اس کی وجہ ان کی کم عمری ہے اس لیے کہ فکر کے اتھاہ سمندر سے قیمتی گوہر پالینے کے لیے ایک عمر چاہیے:

اجل سے وہ ڈریں جینے کو جو اچھا سمجھتے ہیں
یہاں ہم چار دن کی زندگی کو کیا سمجھتے ہیں،

جو ہیں اہلِ بصیرت اس تماشا گاہ ہستی میں
طلسمی زندگی کو کھیل لڑکوں کا سمجھتے ہیں

پوچھتا ہوں جو عبرت سے مآلِ ہستی،
راستہ گورِ غریباں کا بتا دیتی ہے،

موت سے کوئی نہ گھبرائے اگر یہ سمجھے
کہ یہ دنیا کے بکھیڑوں سے چھڑا دیتی ہے

گل کو خنداں بلبلوں کو نوحہ گر دیکھا کیے
باغِ دو عالم کی دو رنگی عمر بھر دیکھا کیے

پئے تسلیم سر جھکتا تھا سب کا جن کے ایواں میں
انھیں کی خاک اب پامال ہے گورِ غریباں میں

بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں
کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

لیکن اس کے ساتھ گھنگھروؤں کی جھنکار بھی گونجتی ہے اور لب و رخسار کے بوسوں کے بھی ذکر ملتے ہیں جو اکبر کی بزمِ رقص و سرور کی یاد بھی دلاتے ہیں اور دورِ ہوسناکیوں کے قصّے بھی سناتے ہیں:

جذبۂ دل نے میرے، تاثیر دکھلائی تو ہے
گھنگھروؤں کی جانبِ در کچھ صدا آئی تو ہے،

آپ کے سر کی قسم میرے سوا کوئی نہیں
بے تکلف آئیے کمرے میں تنہائی تو ہے

دل دھڑکتا ہے مرا، لوں بوسہ رخ یا نہ لوں
نیند میں اس نے دُلائی منہ سے سرکائی تو ہے

پہلے ہی چال، آپ کی تھی فتنہ زا حضور
گھنگھروؤں نے اور فتنۂ محشر بنا دیا

اور کبھی وقت نزع عاشق کا حال روایتی انداز میں بیان کرتے ہیں:
وہ بالیں پہ ہیں وقت نزع کیونکر ان سے رخصت ہوں
نہیں طاقت اشارے کی بھی، مجھ دم بھر کے مہماں کو
وہ آئے بھی جو بالیں پر تو ایسے وقت میں آئے
کہ فرط ضعف سے ہم کر نہیں سکتے اشارہ تک

ان اشعار کو پڑھتے وقت غالب کا یہ شعر آہستہ آہستہ گنگناتے جائیے:
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اسے پر کس وقت

اکبر الہ آبادی کے یہاں اس دور میں کچھ مسلسل غزلیں بھی ملتی ہیں جو نظم کا لطف پیدا کرتی ہیں اور جو اکبر کی نظم گوئی کے مزاج کی طرف اشارہ کرتی ہیں ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:
کہیں دل ہوں کہیں باعث بیتابیِ دل ہوں،
کہیں اندازِ بسمل ہوں کہیں میں نازِ قاتل ہوں
کہیں تمکین خوبی ہوں، کہیں ہنگامہ الفت ہوں
کہیں رنگِ رخِ گل ہوں کہیں شورِ عنادل ہوں
کہیں جلوہ ہوں صورت کا، کہیں ہوں شاہدِ معنیٰ
کہیں ہوں محملِ لیلیٰ، کہیں لیلائے محمل ہوں

اکبر الہ آبادی کی اس دور کی غزلوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو جہاں یہ پتا چلتا ہے کہ عام طور سے ان کی غزلیں قدیم روایتی رنگ میں ہیں اور اکثر مقامات ایسے نظر آتے ہیں جہاں ان کے کلام میں اساتذہ کی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے، وہاں اس بات کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اکبر کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اور معاملاتِ حسن و عشق کے اظہار کی بھی صلاحیت رکھتے تھے، البتہ ان کے عاشقانہ کلام میں چند مقامات ایسے بھی نظر آئے ہیں جن میں ہلکے جذبات

و خیالات کا اظہار ملتا ہے، یہاں تک کہ گھنگھرو کے بجنے کی صدائیں بھی سنائی دیتی ہیں شاید اس لیے کہ اکبر الہ آبادی کی زندگی کا ایک حصّہ ایسے ماحول سے قریب بھی رہا ہے اس کے تجربوں سے بھی گزرا ہے اور متاثر بھی ہوا ہے۔

البتہ ہمیں اس بات پر بجا طور پر حیرت ہوتی ہے کہ اکبر الہ آبادی جنھوں نے اپنی عمر کے ابتدائی تینس ۲۳ سال کے آخری چودہ برس محض ایسی غزل گوئی میں گزارے ہیں جوان کے مزاج کے مخصوص رنگ یعنی طنز و مزاح سے متاثر ہونے سے بچ گئی ہے [1] حالانکہ اس عمر کا تعلق جذبات کی فراوانی سے ہے اور طنز و مزاح کو جذبات سے بڑی قربت ہوتی ہے، پھر اسی دوران عمر میں وہ ۱۸۵۷ء کی پریشانیوں اور تباہیوں سے بھی دوچار ہوئے۔ اسی عمر تک پہنچتے پہنچتے انھیں بعض انگریزوں سے ملنے اور بعض کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، اسی دوران میں ان کی شادی ایک ایسی خاتون سے ہوئی جو عمر میں اُن سے بڑی تھیں اور مزاج میں بھی انھوں نے مماثلت نہیں پائی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شادی ناکام ہو گئی تھی، پھر "بوٹا جان"، ان کے خانہ دل میں شریکِ حیات بن کر داخل ہوئی، اور تیسری شادی کے منزل سے بھی انھیں گزرنا پڑا۔ یہ سب ہوتا رہا اور ایک سال دو سال دس سال، بیس سال، تیس سال ان کی عمر کے گزرتے گئے، یہاں تک کہ ۱۸۶۷ء کا زمانہ آجاتا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ ابتدائی زندگی کے تینس ۲۳ اہم سال گزار دیتے ہیں لیکن وہ بند نہیں ٹوٹ پاتا جواُن کو طنز و مزاح کا منفرد شاعر بننے کا موقع فراہم کرتا۔

---

[1] معلوم نہیں رام بابو سکسینہ کو اس دور کا وہ کلام جس میں طنز و مزاح پایا جاتا ہے کہاں سے دستیاب ہوا کہ بغیر نمونہ کلام پیش کیے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل عمر ہی میں ان کو اس رنگ سے خاص لگاؤ تھا کیونکہ اس زمانہ کے کلام میں بھی متین اشعار کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں مذاقیہ اور ظریفانہ اشعار کہہ جاتے ہیں۔"

[تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ: مترجمہ مرزا محمد عسکری: چوتھی بار ۱۹۵۲ء ص ۴۲۷]

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کو شروع کرنے کے لیے انھیں عمر کے تیس سال تک انتظار کیوں کرنا پڑا اور اودھ پنچ کا سہارا لینے کی نوبت کیوں آئی ــــ یا تیس سال ہوتے ہوتے وہ حالات کون سے پیدا ہو گئے تھے جنھوں نے انھیں طنز و مزاح کے راستے پر لگا دیا اور اس راہ کا محترم رہبر و بنا دیا اور سید اکبر حسین کو اکبر الٰہ آبادی کی شخصیت میں لاکے کھڑا کر دیا ــــ تو جواب اس کے سوا کیا ملتا ہے کہ تجربات کی تلخیوں، ماحول کی زہرناکیوں اور بڑھتی ہوئی عمر کے شعور نے انھیں تلخ نوائی پر مجبور کیا ــــ اور مملکت طنز و مزاح کا امیر قرار دیا۔

(اکبر الٰہ آبادی۔ ناشر بہار اردو اکادمی، پٹنہ ۱۹۸۴)

خواجہ الطاف حسین حالی ایک محبِ وطن

حالی اردو کے پہلے باضابطہ محب وطن دانشور ہیں جنھوں نے اپنی شاعری اور نثر کو اپنے وطن سے محبت کے سچے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ وطن سے، اہل وطن سے متعلقین وطن سے بے انتہا محبت کرتے تھے، اسی لیے اس کے زوال سے مضطرب، اس کی بے بسی سے پریشان، اس کی غلامی سے فکر مند اور اس کے افراد کی بے عملی اور بے راہ روی سے افسردہ اور رنجیدہ رہنے لگے تھے لیکن انھوں نے زندگی کے کسی موڑ پر ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے وطن سے محبت کا اقرار، اس کی خرابیوں پر نکتہ چینی، اس کی برائیوں کی اصلاح پر اصرار اور اس کی خوبیوں پر مسرت کے اظہار کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا ان کی خواہش تھی کہ ہندستانیوں کے دلوں میں وہ نہ صرف وطن اور اس کی ہر چیز سے الفت اور گہری وابستگی پیدا کر دیں بلکہ انھیں احساس دلادیں کہ ان کی ترقی اور خوش حالی سے ان کے وطن کی ترقی اور خوش حالی ہے اسی لیے وہ ہندستانیوں میں زندگی کی تڑپ اور بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھیں آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ کرتے رہے، غلامی کے خلاف نفرت پیدا کرتے رہے اور ان میں آپس میں اتحاد و اتفاق کا جذبہ بیدار کرتے رہے تاکہ ہندستانی بہتر، معتبر اور قابل رشک زندگی اختیار کر سکیں۔

اسی لیے انھوں نے خاص طور سے اپنی شاعری کو اپنے وطن اور اس کی ہر چیز سے گہری دلچسپی کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اسی لیے انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں تاکہ بچے اچھے ہندستانی بنیں، اور اپنے وطن کو اچھا بنائیں،

عورتوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور ان کے جائز حقوق دلانے کی طرف اہل وطن کو مائل کرنے کی کوشش کی تاکہ ہر گھر تہذیب و تعلیم کا گہوارہ بن سکے۔ اچھے اور محترم اور قابل قدر لوگوں کی وفات پر شخصی مرثیے لکھے، اور ان کی اچھائیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی، تاکہ ان سے بہتر زندگی کی تعمیر میں مدد ملے اور دوسروں کی رہبری کی جا سکے، تعصب کے خلاف آواز اٹھائی، زبان کے معاملے میں درمیانہ روی اختیار کرنے کی تلقین کی اور ماضی کے سڑے گلے ماحول، بیمار معاشرہ اور بے عملی کی فضا سے نکل کر، اچھے انسان، باعمل فرد، وطن دوست ہندوستانی بننے پر زور دیا اور بلاشبہ وہ بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ محبِ وطن حالی کہلائے اور مصلح کا درجہ پایا۔

حالی محبِ وطن پیدا ہوئے تھے، قدرت نے ان کے اندر اصلاح کی لازوال صلاحیت ودیعت کی تھی۔ ان میں نیکی، ہمدردی اور انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھیں اس راہ پر چلنے، آگے بڑھتے رہنے اور کامیاب ہونے میں ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی اور اس میں ہندستانیوں کی شکست وریخت کو بہت دخل ہے۔ اس حادثہ اور اس کے ردِ عمل نے ان کے لیے تازیانے کا کام کیا۔ جس نے الطاف حسین خستہؔ کو، الطاف حسین حالیؔ بنا دیا۔

حالی آزادی کی پہلی جنگ سے بتیس۲ سال پہلے ۱۸۳۷ء میں اس ہندستان میں پیدا ہوئے تھے جو مایوسی، زبوں حالی، شکست خوردگی، احساسِ کمتری، بے عملی اور بے علمی میں روز بروز مبتلا ہوتا جا رہا تھا، اور جس میں طرح طرح کے مذموم رسم رواج، اخلاقی گراوٹیں اور بری خصلتیں عام ہونے لگی تھیں۔ جس نے پورے ہندستان کو کمزور کر دیا تھا اور جس کا انجام وہی ہونا تھا جو ۱۸۵۷ء میں ہوا۔

لیکن اس المناک شکست کا ایک تابناک پہلو یہ سامنے آیا کہ ملک کے اکثر سنجیدہ اور مخلص اصحاب وطن کے لیے فکر مند ہو گئے اور ایک بہتر ہندستان، خوش حال ہندستان، تعلیم یافتہ ہندستان، طاقت ور ہندستان

اور آزادیٔ ہندوستان کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ ایسے ہی لوگوں میں خواجہ الطاف حسین حالی تھے۔ جنھوں نے نہایت سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ اپنی زبان اور اپنے قلم کو ہتھیار بنایا اور اپنے وطن کی تعمیر کے لیے آگے بڑھے۔

یہ بات نہایت یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ حالیؔ سے پہلے اردو شاعری میں وطن سے ویسی محبت کا اظہار جسے ہم حب الوطنی کہتے ہیں، نہیں ملتا۔ دلّی کی تباہی کا تذکرہ نہایت غم ناک انداز میں اکثر شعرا نے کیا ہے۔ غزل کے اشعار میں بھی ایسے خیالات مل جاتے ہیں جو اس زمانے کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات کی نشان دہی کرتے ہیں لیکن ویسی شاعری جس میں وطن سے محبت کی تڑپ ہو خود حالیؔ کے یہاں انجمن پنجاب کے مشاعروں سے پہلے نظر نہیں آتی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ۱۸۶۹ء میں اپنے استاذ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی موت پر جو "مرثیہ غالب" انھوں نے قلمبند کیا تھا اس میں ان کی وفات کو ہندوستان کا بڑا نقصان قرار دیتے ہوئے اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا جن سے ان کی وطن دوستی ظاہر ہوتی ہے:

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات جس کی تھی بات بات میں اک بات

تھیں تو دلّی میں اس کی باتیں تھیں لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات،

اہلِ ہند اب کریں گے کس پر ناز رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

ہند میں نام پائے گا اب کون سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ہم نے جانی ہے اس سے قدرِ سلف ان پہ ایمان لائے گا اب کون

پورا "مرثیۂ غالب" ایک ایسے نقصان کا احساس دلاتا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ شخصی مرثیوں میں جو غمناک فضا عام طور سے پیدا ہوتی ہے وہ اس میں بھی ہے۔ لیکن وہ انفرادی غم ہوتا ہے سوائے اُن اشخاص سے

متعلق مرثیوں کے جو ملک و قوم کے لیے باعث فخر بن جاتے ہیں، غالب کی شخصیت ایسی ہی تھی غالب کو حالی نے خود دیکھا اور ان کے دل نے غالب کی عظمت کو محسوس کیا اس لیے اس ترکیب بند کو حالی کی حب الوطنی کا ابتدائی نمونہ سمجھا جائے تو بجا ہے۔

لیکن جب حالی انجمن پنجاب سے وابستہ ہوتے ہیں اور لاہور کے اُن نئے طرز کے چار مشاعروں میں جن کی بنیاد محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کے اشارے پر ڈالی تھی چار نظمیں برکھارت، نشاط اُمید، حب وطن، مناظرہ رحم وانصاف پڑھیں جن میں حب الوطنی کا جذبہ کبھی جائے پیدایش سے رشتہ جوڑتا ہے کبھی کسی ایک مقام کے لیے مخصوص نظر آتا ہے اور کبھی پھیل کر ملکی بن جاتا ہے تو حالی کے واضح سماجی شعور اور سیاسی افکار سامنے آتے ہیں۔

پہلی نظم "برکھارت"، کی فضا خالص ہندستانی ہے لیکن قابل تعریف اس لیے ہے کہ حالی اس فضا کو اپنی ہلکی پھلکی زبان میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں البتہ نظم جب اختتام کو پہنچتی ہے تو حالی کی محدود حب الوطنی بیدار ہونے لگتی ہے اور وہ اپنے شہر پانی پت کو یاد کر کے بیتاب سے ہو جاتے ہیں وہ خود لکھتے ہیں:

"یہاں سے اخیر تک کچھ اشعار بہ رعایت موسم اپنے حسب حال بے اختیار قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ اُن دنوں ہجوم امراض اور دیگر عوارض کی وجہ سے لاہور میں رہنا فی الواقع نہایت شاق معلوم ہوتا تھا اور وطن کی طرف واپس آنے کے لیے کوشش کی جاتی تھی[1]"

اس نظم کے کچھ حصے ملاحظہ کیجیے:

بیزار اک اپنی جان و تن سے — بچھڑا ہوا صحبت وطن سے،

غربت کی مصیبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا

غمخوار ہے کوئی اور نہ دل جو — اک باغ میں ہے پڑا لب جو

---

[1] مجموعہ نظم حالی: ایجوکیشنل بک ہاوس۔ علی گڑھ ص ۴۵ (حاشیہ)

ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی آپس کی خبر ہے نہ گھر کی
ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آ کے لگی تڑپنے پیہم اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھوکے تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے یاد آئے مزے کبھی کبھی کے

اور ——

اے چشمۂ آب زندگانی گھٹیو نہ کبھی تیری روانی،
جاتی ہے جدھر تری سواری بستی ہے اس طرف ہماری
پائے جو کہیں مری سبھا کو دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو
اول کہیو سلام میرا پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا فرقت میں تمہاری آئی برکھا

اور پانی پت کی ایک ایک چیز یاد کرتے ہوئے نہایت پُر درد لہجے میں کہتے ہیں :

پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد

لیکن وطن سے محبت کا وہ جذبہ جو برکھارت میں محدود مقامی محسوس ہوتا ہے "حبِ وطن" میں وسیع تر ہو کر ملکی بن جاتا ہے۔ یہ اردو میں پہلی نظم ہے جس میں نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں وطن سے محبت کا راگ نہایت سچے جذبے کے ساتھ الاپا گیا ہے۔ اس نظم کی ابتدا محدود نظریۂ وطن سے ہوتی ہے اور جو نہایت مدھم لے کے ساتھ آہستہ آہستہ ارتقائی سفر طے کرتی ہے :

اے سپہر بریں کے سیارو اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری اے شب ماہتاب تاروں بھری
اے نسیم بہار کے جھوکو، دہر ناپائدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رہنا　　تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم مری دل لگی کے سامان تھے　　تم مرے درد دل کے درماں تھے
تم سے کٹتا تھا رنج تنہائی　　تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

لیکن ـــــــــــــــ

پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار　　جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے　　نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیر گلشن ہے جی کا اک جنجال　　شب مہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لب دیار　　جس طرف جائیں جی نہیں لگتا

یہ محدود وطنی جذبہ نظم کے اس حصّے میں وسیع تر ہوتا محسوس ہوتا ہے :

تیری اک مشت خاک کے بدلے　　لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا　　کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

یہیں سے وہ ہندستان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں، ہندستان پر آریاؤں کے حملے کا ذکر کرتے ہیں، رام چندر جی کے بن باس کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، رسول اللہ کی ہجرت کی یاد دلاتے ہیں، حضرت یوسف کی بے وطنی پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر حب الوطنی کیا ہے مثالوں سے بتاتے ہوئے وطن کے لیے فکر مند کرنے کی کوشش کرتے ہیں :

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو،　　اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　ورنہ کھاؤ پیو، چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ　　دل کو دکھ بھائیوں کی یاد دلاؤ

اور پھر ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں،

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو　　بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہو وے یا کہ ہو حنفی　　جین مت ہو وے یا ہو ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد　　شہر ہیں اتفاق سے آباد

اور آپس میں نا اتفاقی کی وجہ سے غلامی کا احساس اس طرح دلاتے ہیں:

ہند میں اتفاق ہو تو اگر، کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

اور نا اتفاقی کے نتیجہ پر روشنی ڈالتے ہوئے منصفانہ انداز اختیار کرتے ہیں:

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا کبھی درّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا کبھی محمود نے غلام کیا،
سب سے آخر میں لے گئی بازی اک شائستہ قوم مغرب کی

پھر اہل دولت اور اہل کمال کی بے حسی اور ملک سے ان کی بے توجہی پر تبصرہ کرتے ہوئے صاف صاف کہتے ہیں:

بھرتے حب وطن کا گو دم ہیں پر محبِ وطن بہت کم ہیں

اور شرم دلاتے ہیں؛

اہل انصاف شرم کی جا ہے گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے؟
تم نے دیکھا ہے جو، وہ سب کو دکھاؤ تم نے سیکھا ہے جو، وہ سب کو سکھاؤ
یہ جو دولت تمھارے پاس ہے آج ہم وطن اس کے ہیں بہت محتاج

علم کو عام کرنے کی بھی ترغیب دلاتے ہیں؛

علم کو کر دو کو بہ کو ارزاں ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

اور اس کے ساتھ قوم اور ملک کی تعمیر کے لیے جیسی جیسی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں فرانس اور انگلستاں کی مثال پیش کرتے ہوئے ایک بار پھر کہتے ہیں،

گر رہنا چاہتے ہو عزت سے بھائیوں کو نکالو ذلّت سے

بلاشبہ "حبِ وطن" حالی کی پہلی نظم ہے جس میں بھرپور وطنی جذبے کے ساتھ ان کے سیاسی، سماجی معاشی اور تعلیمی فکر و نظر کا پتا چلتا ہے۔ یہ جذبہ ان کا اپنا تھا، ان کے دل میں اہل وطن کے لیے بڑا درد تھا، طبیعت حساس تھی، اصلاح کی خواہش رکھتے تھے خدمت کرنے سے گریز نہیں کرتے

تھے، چنانچہ اس جذبہ نے ان سے "مدوجزرِ اسلام"، جیسی یادگار نظم لکھوائی۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے دہلی کا سفر کیا تھا جس نے پانی پت کی چھوٹی دنیا سے نکال کر بڑی اور رنگارنگ دنیا میں انھیں لاکر کھڑا کر دیا تھا جہاں ان کی فکر اور علم میں وسعت پیدا ہوئی وہیں دہلی پر زوال کی آمد آمد کا انھوں نے نظارہ کیا تھا اور پہلی جنگِ آزادی میں شکست کے بعد اس تباہی اور بربادی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس نے پوری قوم میں ابتری پھیلادی تھی جس کا اظہار انھوں نے اس طرح نہایت درد وغم کے ساتھ کیا ہے:

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

لے کے داغ آئیگا سینہ پہ بہت اے سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھو گے کبھی لطف سہانا ہرگز

یہ ایک شہر کا مرثیہ نہیں ہے پوری ایک تہذیب کا اور قومی افکار و تصورات کا ماتم ہے اس میں انگریزوں کے خلاف چھپی ہوئی نفرت بھی جھلکتی ہے یہاں بھی محدود حبُ الوطنی وسیع تر حب الوطنی سے ہاتھ ملاتی محسوس ہوتی ہے۔ حالی نے مسدس کے دیباچے میں بھی اپنے اس طرح کے جذبات پیش کیے ہیں:

"قوم کی حالت تباہ ہے عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں، تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پرواہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں، ایسے میں جن سے جو کچھ بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی ہماری سلامتی ہے"

ان حالات سے حالی نہایت، غم زدہ پریشان اور فکر مند تھے کہ:

"قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ نہ کام لینا شرم کی بات ہے"

اور حالی جو پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے بے اختیار ہو گئے جس کے نتیجے میں ۱۸۷۹ء مسدس کی تخلیق عمل میں آئی۔ جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، گھر گھر جس کی آواز پہنچی اور عورت، مرد، بچے جوان بوڑھے متاثر ہوئے۔

رام بابو سکسینہ نے اس مسدس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بڑی سچی بات کہی ہے کہ:

"مولانا کی سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی یہ الہامی کتاب ہے اور اس کو تاریخ اتفاق ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے یہ ایک نیا تارہ ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندستان میں قومی اور

وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پُر اثر اور پُر درد نظموں کے واسطے مسدّس نہایت موزوں چیز ہے[1]،،

سردار جعفری نے بھی اس کی تعریف کی ہے لیکن نہیں معلوم کس جذبے سے مغلوب ہو کر ایک ایسی خامی نکال بیٹھے ہیں جو کسی طرح حب الوطنی کی راہ میں خامی نہیں کہی جا سکتی ہے ان کا خیال ہے:

،، حالی کا مسدّس اردو زبان کی پہلی نظم ہے جسے ہم عظیم کہہ سکتے ہیں، یہ حالی کا شاہکار تھا اور اس نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا باوجود اس کے کہ اس کا خطاب مسلمانوں تک محدود ہے اور یہی اس کی خامی ہے، اس میں ہندستان کی فضا ہے۔ اس میں حالی نے بے پناہ خلوص سے ہندستان کے جاگیر داری انحطاط کی تصویر کھینچی ہے[2]،،

پہلی بات تو حرف حرف درست ہے کہ ،،اس کا خطاب مسلمانوں تک محدود ہے،، لیکن یہ خامی کیوں ہے۔ کیا اس ملک کے باشندوں کی اصلاح کی فکر حب الوطنی کے دائرے سے خارج کہی جائے گی۔ اس میں بہت سے بند ایسے بھی ہیں جنھیں کسی مذہب کا ماننے والا پڑھ کر متاثر ہو سکتا ہے اور ان سے اپنی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ میں یہاں صرف ایک بند پیش کر رہا ہوں:

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا　　　کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا　　　خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

یہاں انسان کے کام آنے کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی بہتر پیام ہم وطنوں کو دیا جا سکتا ہے۔ آج کے ہندستان میں نہایت

---

[1] تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ ص ۴۱۰

[2] ترقی پسند ادب: سردار جعفری ص ۹۸

شدّت سے اس پیام کی پیاس روز بروز محسوس کی جارہی ہے۔

مولانا حالی کی بعض نظموں میں انگریزی حکومت کی برکتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے "فلسفہ ترقی"، میں حالی صاف صاف کہتے ہیں:

دوستو! شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب
آرہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر

رو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر

دستکاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

لیکن ایسی نظموں کے ان حصّوں پر چونکنا نہیں چاہیے نہ بدگمان ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس وقت تک ہندستان میں کوئی مضبوط سیاسی جماعت وجود میں نہیں آئی تھی ۱۸۸۵ء میں جس کانگریس کی بنیا دپڑی تھی اس کی حقیقت اس وقت جو کچھ بھی تھی اس سے کون واقف نہیں ہے، حالی اس وقت کے حالات کے تحت تنہا اس سے زیادہ کیا کر سکتے تھے کہ ملک کے حالات سے آگاہ کر کے اہل وطن کو اپنے وطن سے دلچسپی پیدا کرنے کی طرف رجوع کرتے اور حکمراں طبقہ کی خوبیوں کو بیان کر کے اہل وطن کو ان کی طرف متوجہ کرتے اور ان کے علم اور دوسری خوبیوں سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتے اور حکمرانوں کو اس بات کا احساس دلاتے کہ ہم ان سے برسرپیکار نہیں ہیں بلکہ ان سے ملکر رہنا چاہتے ہیں اور علوم و فنون کی دنیا میں ان کی قابل تعریف ترقیوں سے فیض اٹھانا چاہتے ہیں۔ سو انھوں نے نہایت دانشمندی سے یہی کیا اور اس طرح حالی انگریز حکومت کی تعریف کے پردے میں ملک کی تعمیر میں حصّہ لیتے رہے۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کا سیاسی شعور واضح ہوتا گیا اور ان میں بے باکی اور ان کے خیالات میں مضبوطی پیدا ہوتی گئی۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ:

"غلام جب تک غلام ہے حقیر و ذلیل سمجھا جائیگا خواہ وہ خود غلام بن گیا ہو اور خواہ جبر سے اس کو غلام بنایا گیا ہو"[۲]

---

[۲] مقالات حالی حصہ اول ص ۱۹۱ حالی کا سیاسی شعور: جذبی ص ۱۷۰

چنانچہ غلام کی ذلت سے وہ مضطرب تھے اور آزادی کی نعمت حاصل کرنے کے لیے بے چین اور متفکر رہنے لگے تھے، جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

ایک ہندی نے کہا حاصل آزادی ہے جنھیں — قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں — قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم

ایک موقع پر انگریزی حکومت پر نکتہ چینی اس طرح کرتے ہیں:

پاؤ گے نہ کوئی قاف سے لے تا قاف — حق تلفیوں کے دل میں نہ ہوں جس کے شگاف
گر غور سے سنیے غل ہے یہی چاروں طرف — انصاف!!! انصاف! آہ انصاف!!! انصاف

حالی نے انگریزوں کی اس پالیسی کو بھی کہ "دو لڑاؤ اور حکومت کرو"، کو طشت از بام کیا ہے:

تدبیر یہ کہتی ہے کہ جو ملک ہو مفتوح — واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی — یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر — مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن — جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

حالی تعلیم کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لیے ملک میں تعلیم کے عام نہ ہونے سے پریشان تھے اور اپنی قوم کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے بار بار متوجہ کرتے تھے:

زندگی ہے قوم کی اب منحصر تعلیم پر — ورنہ سن لو! قوم کے نزدیک آپہنچی اجل
سلطنت ہو یا ریاست قوم ہو یا خاندان — جو نہیں تعلیم پہ مائل وہ سب جائیں سنبھل

اور ہمیشہ اس تعصب کے خلاف نبرد آزما رہے جس میں دوسروں کی اچھائیوں سے فیض اٹھانا جرم قرار دیا جاتا ہے:

سہل مت سمجھو تعصب کو بُری ہے بلا — کر دیا اس نے قوموں اور گھرانوں کو فنا

ان کے زمانہ میں انگریزی قانون کی جو حالت تھی اس کا بھی اس طرح مذاق اڑاتے ہیں:

کہتے ہیں ہر فردِ انساں پر ہے فرض — ماننا قانون کا بعد از خدا

پر جو سچ پوچھو نہیں قانون ہیں | جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا
اس میں پھنس جاتے ہیں جو کمزور ہیں | اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا،
پر اسے دیتے ہیں توڑ، اک آن میں | جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا
حق میں کمزوروں کے ہے قانون وہ | اور نظر میں زورمندوں کی ہے ''لا ''،

ایک سچے محبِ وطن کے لیے لازمی ہے کہ تعصب اس میں نام کو نہ ہو اور اس کی کوشش یہی ہو کہ ملک میں بے تعصبی عام ہو تاکہ اتحاد و اتفاق سے ملک مضبوط بھی ہو ترقی بھی کرے۔ مولانا حالی کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا بیان ہے کہ ''تعصب اُن میں نام کو نہ تھا وہ ہر قوم اور ملّت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے''، اور اس کے ساتھ اگر یہ بھی کہا جائے کہ وہ بے تعصبی کو عام کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے تو مناسب ہو گا۔ چنانچہ جب ہندستان میں انگریز ''لڑاؤ اور حکومت کرو ''، کی پالیسی کی تحت ہندستانیوں میں تعصب پیدا کرنے کی کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے اور ملک میں فرقہ پرستی کا زور بڑھنے لگا اس وقت بھی حالی مایوس نہ تھے انھوں نے مولانا عبدالحلیم شررؔ کو لکھا تھا:

''لیکن درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں دوستی اور یکجہتی کے روابط مستحکم نہیں ہو سکتے۔ بے شک بدقسمتی سے اسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہو گئے ہیں جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے چھوٹ گئے ہیں لیکن ہمارے پاس اس امر کے باور کرنے کے وجوہات موجود ہیں کہ جس قدر ملک میں ترقی ہوتی جائے گی، جس قدر لوگ قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اور جس قدر نا اتفاقی کے مضر نتائج لوگوں پر آشکارا ہوتے جائیں گے اس قدر ان پر یہ راز ظاہر ہوتا جائے گا کہ بغیر اتحاد اور یکجہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے رہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں وقعت و توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔ یہی تعلیم جس نے بالفعل دونوں قوموں میں زہر گھولا ہے آگے چل کر

یہی زہر ایک دن تریاق کا کام کرنے والا ہے ،،

چنانچہ حالی اتفاق و اتحاد کی مختلف انداز سے تلقین کرتے رہے اس سلسلے کی ان کی ایک رباعی ملاحظہ کیجیے :

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں ۔۔۔ شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا ۔۔۔ وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

حالی نے اپنی شاعری میں بے تعصبی سے کام لیتے ہوئے ہندوستانی تلمیحات اور ہندی کے ایسے بے شمار الفاظ استعمال کیے ہیں جو آسانی سے اردو میں کھپ سکتے تھے اور زبان کی خوبیوں میں اضافہ کر سکتے تھے ان کا خیال تھا کہ :

"اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لیے صرف دلی اور لکھنو کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے ،، ۵ھ

مولوی عبدالحق رقمطراز ہیں کہ حالی لغت کی ترتیب کے سلسلے میں ایک بار فرمانے لگے :

"... اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرنے چاہییں ،، ۶ھ

اور بلا شبہ انھوں نے ہندی الفاظ، گھریلو محاورے اور ہندوستانی تلمیحات ایسی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ ایسے ہی موقعوں کے لیے ان کا وجود ہوا تھا چنانچہ ان کی تقلید میں دوسروں نے بھی ایسے الفاظ اور محاوروں کا استعمال شروع کر دیا تھا ۔

یہ بھی الطاف حسین حالی کی حب الوطنی کا ہی نتیجہ تھا کہ انھوں نے سدیشی

۴ھ مکاتیب حالی ص ۵۴ بحوالہ حالی کا سیاسی شعور : جذبی ص ۱۶۰

۵ھ چند ہم عصر : عبدالحق ص ۱۵۰ ۶ھ چند ہم عصر : عبدالحق ص ۱۵۰

تحریک کا عملاً ساتھ دیا اس سے متعلق ان کی وہ تحریر ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے اوائل ۱۹۰۷ء میں دیا نرائن نگم ایڈیٹر ماہنامہ "زمانہ"، کانپور کو ان کے تین سوال کے جواب میں دیے تھے۔

پہلے سوال کا جواب :

جس قدر تحریکیں ابتک ہندوستان کی بھلائی کے لیے دیسیوں کی کی طرف سے ہوئی ہیں میرے نزدیک ان سے کوئی ایسی تحریک جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہنچنے کی امید ہو سودیشی تحریک سے بہتر نہیں ہوئی

دوسرے سوال کا جواب :

ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی نہ صرف سودیشی تحریک میں بلکہ ہر کام میں جو ہندوستان کی عام بھلائی سے تعلق رکھتا ہو اشد ضرورت ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں سودیشی تحریک جیسی ہندوؤں کے حق میں مفید ہے ایسی ہی مسلمانوں کی حق میں مفید ہے۔

تیسرے سوال کا جواب :

اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا جاتا ہے لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہوگیا جس راستہ سے ملک کی دولت غیر ملک میں کھچی جاتی ہے مگر اس راستہ کو بند کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں اور اس کے لیے جلدی کرنا نیچر سے مقابلہ کرنا ہے ع

ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو اس کی بہت جلد کامیابی ہوئی ہے[1]

حالی کے دل میں عورتوں کے لیے بڑا احترام کا جذبہ تھا وہ معاشرے میں

---

[1] مقالات حالی جلد اول ص ۳۶۶

انھیں بہتر مقام دلانے کے حق میں تھے اسی لیے ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک روا رکھنے کو پسند کرتے تھے وہ جانتے تھے کہ ان کی ترقی کے بغیر ملک کی ترقی ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ۲ دو نظمیں "مناجات بیوہ"، اور "چپ کی داد"، پیش کی جا سکتی ہیں دونوں اصلاحی نظمیں ہیں اور خالص ہندوستانی عورتوں کے مزاج اور اعمال کی ترجمان ہیں اور ان کی اصلاح کے سلسلے میں نہایت مخلصانہ کوششیں شمار کی جاتی ہیں، دونوں نظمیں زبان کی سادگی، دردمندی اور حقیقت پسندی کی وجہہ سے بہت مقبول ہوئیں اور ان سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ ان نظموں کو بھی حب الوطنی کا قیمتی سرمایہ سمجھنا چاہیے۔ کبھی کبھی اہل وطن کو اس انداز سے بھی حالی نے جگانے کی کوشش کی تھی:

یارو نہیں وقت عیش و آرام کا یہ — موقع ہے اخیر فکر انجام کا یہ
بس حب وطن کا جب چکے نام بہت — اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ اصلاح اور خدمت خلق کے کاموں میں ناکامیوں اور اہل وطن کی بے راہ رویوں کی وجہہ سے حالی مایوس اور دل شکستہ سے نظر آنے لگتے تھے اگرچہ ان پر یہ کیفیت بہت کم طاری ہوئی۔ یہ رباعی ان کے اسی احساس کی ترجمانی کرتی ہے:

کہدو! جنھیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ — طعنے جھیلو، بُرا سنو، گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سرِ دست — گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ

نظموں کے علاوہ الطاف حسین حالی کے یہاں غزلوں میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن سے نہ صرف اس زمانے کے ہندوستان کے حالات سے اگاہی ہوتی ہے بلکہ محبِ وطن حالی کے دل کے اضطراب اور ان کی وطن سے والہانہ محبت کا احساس ہوتا ہے:

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں رہزن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہے گی

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

منادی نہیں حق کی کچھ دل لگی بہت یاد ہیں درکار قربانیاں
ہو ناپید جس ملک میں اتفاق ہیں آبادیاں واں کی ویرانیاں
خود بڑا بن کر دکھاؤ آپ کو باپ دادا کی بڑائی ہو چکی
ہو چکی قوم مردہ، پر جلاد ابھی درے لگائے جاتا ہے

حالی کی پوری زندگی اور ان کے کلام کے مطالعہ سے اُن کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک سیدھے سادے سچے انسان کی ہے۔ وہ اپنے وطن ہندوستان سے بے پناہ محبت کرتے تھے، اس کی بدحالی سے پریشان تھے اور اس کی خوش حالی کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ انھیں اپنے مقاصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی اور ناکامیوں سے بھی دوچار ہونا پڑا لیکن وہ نا کامیابیوں پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے نہ ناکامیاں انھیں مایوس کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ وہ مسلسل ملک و ملت کی تعمیر میں مصروف رہے یہی ان کی زندگی تھی اور یہی ان کی زندگی کا حاصل ہے۔

(حالی فن اور شخصیت: ہریانہ ساہتیہ اکادمی چنڈی گڑھ ۱۹۸۷ء)

چکبست کی نظم گوئی

"صبح وطن"، پنڈت برج نرائن کے کلام کا واحد مجموعہ ہے جس کی اشاعت بد قسمتی سے ان کی وفات کے بعد ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ پوری کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے، پہلے، دوسرے، تیسرے حصہ میں ۲۹ نظمیں ہیں جو ۱۹۰۵ء تک کہی گئی ہیں، حصہ چہارم میں غزلیات ہیں جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۹ء تک تقریباً پندرہ سال کی مدت کی ہیں۔ اس میں مذہبِ شاعرانہ، جلوۂ معرفت اور دو قطعے بھی شامل ہیں۔ حصہ پنجم میں ابتدائی سات نظمیں اور کچھ متفرق کلام اور رباعیات ہیں جو ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۴ء تک کے دوران کے ہیں۔

ان پانچ حصوں سے الگ دو نظمیں "نذرانہ روح" اور "نظم ظریفانہ" "لارڈ کرزن سے جھپٹ" بھی اس کتاب کے شروع اور آخر میں درج ہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ کلام ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۹ء تک یعنی تقریباً ۲۲ سال پر محیط ہے۔

چکبست ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے تقریباً ۴۴ سال کی عمر پائی، ۱۹۰۸ء میں یعنی تقریباً چھبیس سال کی عمر سے وکالت شروع کی اس پیشہ میں وہ بہت کامیاب رہے ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس پیشہ کے ہنگاموں میں گزرا شاید مختصر زندگی اور مصروف و کامیاب وکالت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اردو ادب کو اپنی شاعری سے زیادہ مالا مال کرتے اور اپنی شاعری کو اپنی فکر کی گہرائیاں عطا کر سکتے۔

چکبست کے زمانہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو سیاسی شعور کی بیداری کا زمانہ ہے حب الوطنی کا نغمہ الاپنے کا زمانہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں جو سیاسی

ہار ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے شکست خوردگی ، احساس کمتری ، پژمردگی ، مایوسی اور غمناکی کی جو فضا پیدا ہوئی تھی اس کے اثرات اب زائل ہوتے نظر آتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ قوم میں احساس زندگی کی لہر پیدا ہونے لگی تھی ۔ مایوسی کی جگہ پُر امیدی لے رہی تھی ، بے عملی کی جگہ جذبہ عمل بیدار ہوا چاہتا تھا ، پُر سکوت فضا میں جوش و خروش کے آثار نمایاں ہونا چاہتے تھے ، اردو شاعری بھی ان حالات سے متاثر ہوئی ، چنانچہ الطاف حسین حالی ، محمد حسین آزاد ، شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے قومی ، وطنی اور اصلاحی نظموں سے ہندوستانی فضا گونج اٹھی تھی ، خود چکبست کے ہم عصر علامہ اقبال کی فکر انگیز نظموں نے حب الوطنی اور حُب قومی کے جذبے کو تیز سے تیز تر اور اس کی جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی کوشش کی تھی ، ایسے پس منظر سے متاثر ہو کر لکھنو کی مخصوص شعری فضا سے ہٹ کر چکبست شاعری کے میدان میں حب الوطنی کا علم بلند کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور بہت مختصر مدّت میں جدید اردو شاعری کی دنیا میں اپنا ایک مخصوص مقام پیدا کر لیتے ہیں ۔

"صبح وطن" ، چکبست کے تقریبًا تمام کلام کا مجموعہ ہے جسے اگرچہ پانچ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن میں نے اسے "مشق ابتدائی کا کلام" ، اور غزلیات کو چھوڑ کر اس طرح چھ حصّوں میں بانٹا ہے ۔

پہلا حصّہ : حب وطن سے متعلق نظموں پر مشتمل ہے جس میں حسب ذیل تین نظمیں ہیں : ۔

خاک ہند ، ہمارا وطن ، وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

دوسرا حصّہ : قومی شاعری کا ہے اس حصہ میں ان نظموں کو شامل کیا گیا ہے ، جو سیاسی ، محدود قومی اور اصلاحی کہے جا سکتے ہیں ، ملاحظہ کیجیے :

سیاسی ۔ آواز قوم ، ہم ہوں گے ، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا ، وطن کا راگ ، مسز بسنت ، فریاد قوم ، قوم کے سورماؤں کی الوداع ، نالہ درد ۔

محدود قومی ۔ قومی مسدّس ، دردِ دل ، نالہ یاس

اصلاحی ۔ پھول مالا (لڑکیوں کے لیے) ، برق اصلاح

تیسرا حصّہ: اس حصّہ میں وہ نظمیں ہیں جن میں شاعر نے اپنے مذہبی جذبات کا
اظہار کیا ہے جو یہ ہیں ــــ کرشن کنھیا، رامائین کا ایک سین۔
چوتھا حصّہ: شخصی مراثی کا ہے جس میں حسب ذیل مراثی ہیں۔
ماتم یاس، گنگا پرشاد ورما، بشن نرائن در، گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا
دھر تلک، اقبال نرائن مسلہ داں، نشتر یاس
پانچواں حصّہ: قدرتی مناظر اور عمارات سے متعلق ہے۔ میرے حساب سے اس میں
صرف ۲ دو نظمیں آتی ہیں سیر دہرادون۔ آصف الدولہ کا امام باڑہ
(لکھنو)
چھٹا حصّہ: متفرقات کا ہے جو مندرجہ ذیل نظموں پر مشتمل ہے۔
معذرت، یادگار بابو گنگا پرشاد ورما، جلوہ معرفت (فلسفہ وید)
قطعہ، گائے۔

(۱)

میری تقسیم کے مطابق پہلا حصّہ خالص حب وطن سے متعلق نظموں پر مشتمل ہے۔ خاکِ وطن چکبست کی مشہور نظم ہے جو اردو شاعری کے وطنی نظموں میں نمایاں درجہ رکھتی ہے اور مسدّس کے آٹھ بند پر مشتمل ہے۔ زبان بیان، انداز، لہجہ ہر اعتبار سے یہ نظم بہت اہم ہے اس کی ابتدا نہایت پُر وقار اور پُرخلوص انداز سے ہوئی ہے جس میں ہندوستان کی بڑائی بیان کرتے ہوئے ہمالہ کی عظمت، رفعت اور اہمیت، مسرتوں سے لبریز ہو کر ظاہر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس کا وجود ہندوستان کے لیے باعث ناز ہے:

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے۔
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نور حسنِ ازل عیاں ہے۔
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عزّ و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

پھر اس ملک کے روشن ماضی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہندوستان نے اس وقت جب وحشت اور درندگی کا دور تھا روحانی فیض پہنچا کر اور علم و دانش کے چراغ جلا کر دنیا کی رہنمائی کی ہے، یہ سرزمین وہ ہے جسے گوتم نے آبرو دی، اکبر نے الفت کا جام پلایا، رانا نے اپنے لہو سے سینچا اور سرمد نے اپنے وطن کو اس کی خاطر خیر باد کہا۔

یہاں کی اذان میں فردوس گوش کی کیفیت ہے اور ناقوس کی فغاں ایک خاص اثر رکھتی ہے۔ کشمیر جنت نظیر کا پہلے ہی جیسا حال ہے۔ دریائے گنگ میں ماضی کی شوکت باقی ہے۔ اس طرح اپنے وطن ہندوستان میں اس کی ساری خوبیاں اب بھی پیشتر کی طرح موجود ہیں لیکن انھیں اس کا غم ہے:

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حبِّ وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

اور پھر نہایت غمگین لہجے میں کہتے ہیں:

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا　　دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا　　اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایمان برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اور دعا کرتے ہیں:

حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

آخری دو بند میں وطن کے ساتھ شدت کی محبت کا اظہار ملتا ہے:

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو

چکبست کی یہ نظم اردو میں وطن سے متعلق نظموں میں نمایاں مقام رکھتی ہے چنانچہ اس نظم کو ہمیشہ مقبولیت بھی حاصل رہی ہے۔ اور اس میں کوئی

شک نہیں کہ اس نے ہندوستانیوں کے دلوں میں وطن سے محبت کے جذبے کو نہ صرف تیز سے تیز تر کیا ہے بلکہ اس نے آزادی کی لڑائی میں حریت پسندوں کو ہر موڑ پر آواز بھی دی ہے اس سلسلے کی ۲ دو نظمیں اور ہیں جو بچوں کے لیے کہی گئی ہیں اور بہت خوب ہیں۔ پہلی نظم "ہمارا وطن دل سے پیارا وطن" اور دوسری نظم "وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک" ہے۔ دونوں نظمیں ہلکی پھلکی رواں دواں اور بڑی شستہ اور پاکیزہ و شیریں زبان میں ہیں۔ ان نظموں میں یہاں کے درخت پھل پھول، ساون کی کالی گھٹا، برسات کی ہلکی پھوار، گنگا، جمنا کوئل مور، سبھی پر اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ بچے بوڑھے، سبھوں کے دل میں وطن کے لیے پیار اور اس کی خدمت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

(۲)

دوسرے حصے میں سات ایسی نظمیں ہیں جو قومی کہی جا سکتی ہیں، جن کی تخلیق کا سبب بھی جذبہ حب الوطنی ہے۔ جن سے کسی حد تک چکبست کے سیاسی شعور کی جھلک ملتی ہے، اس حصہ کی پہلی نظم "آوازۂ قوم" ہے۔ اپریل ۱۹۱۶ء کو ہندوستان کے لیے اہم قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ اسی تاریخ کو مسز بسنٹ نے ہوم رول کو ہندوستان کے لیے بہت اہم بتایا تھا اور چکبست کی نگاہ میں مسز بسنٹ کی اس لیے قدر تھی کہ وہ ہندوستان کی بہی خواہ تھیں۔ چنانچہ مسز اینی بسنٹ کی آواز سے آواز ملا کر کہتے ہیں ؎

زمین سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

اور یہ بھی کہتے ہیں:

وطن کے عشق کا بت بے نقاب نکلا ہے   نئے افق پہ نیا آفتاب نکلا ہے،

اس موقع پر انھوں نے دیکھا کہ شیخ و برہمن محبت اور اتحاد کی شراب پی کر بے خود اور سرمست ہو رہے ہیں اس لیے وہ یہ بھی کہتے ہیں:

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے
اذاں کے نعرۂ دلکش سے حظ اٹھائے ہوئے

کہیں ہے نغمہ ناقوس دل لبھائے ہوئے
اسی فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے
یہ حکم پیر مغان کا ہے نشۂ مے میں
یہ راگ آ کے ملیں ہوم رول کی لے میں

چکبست ہوم رول کے کس قدر خواہش مند تھے اس کا اندازہ ان کے اس اعلان سے ہوتا ہے:

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے   نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اسی سلسلہ کی دوسری نظم "ہم ہونگے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا"، چکبست نے دسمبر ۱۹۱۶ئہ میں کانگریس کے اجلاس میں پڑھی تھی۔ یہ نظم مختصر ہے اور کل چھ بند پر مشتمل ہے، جس کے پہلے بند میں وہ اہل وطن کو مبارک باد دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اہل وطن مبارک تم کو ہو یہ بزم اعلیٰ   جس میں نئی امیدوں کا ہے نیا اجالا
دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا   مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا
ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے   اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

"ہوم رول"، کا مقصد حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں ملک کے اندرونی معاملات میں خود مختاری حاصل کرنا تھا، چکبست بھی اس وقت کے حالات کے پیش نظر حکومت برطانیہ کے وجود کے خلاف نہیں تھے اس لیے "ہوم رول"، کے خواہش مند تھے ان کے نزدیک یہ بھی آزادی کی طرف ایک قدم تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ حق بجانب تھے ایک بند ملاحظہ کیجیے:

یہ آرزو ہے کہ نہر و وفا سے کام رہے   وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر ہیں گلچیں نہ صبح شام رہے   نہ کوئی مرغ خوش الحاں اسیر دام رہے
سر پہ شاہ کا اقبال ہو بہار چمن   رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن
(آوازۂ قوم)

یا

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا   ہم ہونگے، عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

اسی سلسلے کی تیسری نظم "وطن کا راگ" ہے جو ۱۹۱۷ء میں کہی گئی ہے اور آٹھ بند پر مشتمل ہے جس میں ٹیپ کے شعر کے طور پر انھوں نے بار بار کہا ہے:

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہ نظم بڑی رواں ہے، اس میں جوش ہے، آزادی کی لگن ہے، کچھ کر لینے کا جذبہ ہے عزم ہے ارادہ ہے اتحاد کا پیام ہے، وطن سے محبت کی تڑپ ہے، لہجہ میں وقار ہے مٹھاس ہے، اس نظم کا ہر بند حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہے۔ اس نظم میں چکبست کی زبان سے پہلی بار گاندھی جی کا نام نہایت عقیدت کے ساتھ آیا ہے:

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جسکو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یا اس عزم کو ملاحظہ کیجیے:

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائینگے
خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائینگے
جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائینگے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائینگے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھولکے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبست نے ایک نظم "مسز بسنٹ کی خدمت میں "قوم کا پیام وفا"، ۱۹۱۷ء میں ان کی نظر بندی کے زمانے میں کہی تھی، وہ انھیں اس لیے بھی عزیز رکھتے تھے کہ:

"مسز بسنٹ تھیا سوفسٹ ہونیکی حیثیت سے مذہب کی پابندیوں کی سخت مخالف تھیں اور مذہب کے اختلاف کو ختم کرنا ان کا اہم ترین مقصد تھا"

چنانچہ پہلے بند میں ہی چکبست ان کو مخاطب کر کے اس انداز سے کہتے ہیں:

قوم غافل نہیں ماتا تیری غمخواری سے
زلزلہ ملک میں ہے تیری گرفتاری سے
آگ بھڑکی ہے تیری آہ کی چنگاری سے
خاک حاصل نہ ہوا تیری دل آزاری سے
دل ترا قوم کے دامن میں دیئے جاتے ہیں
ہڈیوں کو تری زنداں میں لیے جاتے ہیں

اور مسز بسنٹ کی آپس میں اتحاد و اتفاق کی کوشش کے سلسلے میں اپنے خیال کا

اس طرح اظہار کرتے ہیں:

داستان دین کی دنیا کی سُنائی تو نے — مذہبی بیر کی بنیاد مٹائی تو نے
آگ بھڑکی ہوئی صدیوں کی بجھائی تو نے — راہ انصاف کی اندھوں کو دکھائی تو نے
کس نے گرتی ہوئی قوموں کو سنبھالا ہوتا — تو نہ ہوتی تو نہ دنیا میں اُجالا ہوتا

چکبست وطن پرست تھے اور مختلف مذاہب خاص طور سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میل ملاپ کے خواہشمند بھی تھے اسی لیے مسز بسنٹ ان کی پسندیدہ رہنما تھیں ان کے لیے ان کے دل میں بڑی عزت اور محبت تھی،

"فریاد قوم" اور "قوم کے سورماؤں کی الوداع" دونوں نظمیں ۱۹۱۴ء میں کہی گئی ہیں پہلی نظم "فریاد قوم" کے متعلق تحریر ہے:

"یہ نظم اس زمانے میں تصنیف کی گئی ہے جبکہ دور افتادگان وطن جنوبی افریقہ میں ٹرینسوال کے حکام کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے عاجز تھے اور مہاتما کرم چند گاندھی ان غریب الوطنوں کی حالت درست کرنے کی کوشش میں دل و جان سے مصروف تھے۔ یہ نظم ایک رسالہ کی صورت میں شائع کی گئی تھی اور مہاتما گاندھی کا نام بہ صورت ذیل زیب عنوان کیا گیا تھا،

بخدمت فدائے قوم مسٹر کرم چند گاندھی

نثار ہے دلِ شاعر ترے قرینے پر — کیا ہے نام ترا نقش اس نگینے پر

چکبست لکھنوی[۵]

اس جنگ میں جیت یا ہار سے ہندوستان کا کچھ نقصان یا فائدہ ہونے والا نہیں تھا لیکن چکبست کا جذبہ حب الوطنی یہاں بھی مچل اٹھتا ہے اس لیے کہ سپاہی جو لڑنے جا رہے ہیں وہ ہندوستانی ہیں ان کی بہادری اور دلیری سے ہندوستان کی عزت اور عظمت میں اضافہ ہوگا اور اس سے ہندوستانیوں کو سرخروئی حاصل ہوگی، چنانچہ پہلے بند میں وہ اس انداز سے سپاہیوں کے رخصت ہونے کا منظر پیش کرتے ہیں

---

۵ صبح وطن: برج نرائن چکبست ص ۴۳

ساحلِ ہند سے جرّار وطن جاتے ہیں ۔۔۔ کچھ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیرِ وکفن جاتے ہیں ۔۔۔ تیغ زن، برق فگن، قلعہ شکن جاتے ہیں
سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے ۔۔۔ اِن کے تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

اس بند میں انیس کے رنگ کی جھلک نمایاں ہے، تیسرے بند میں ہندوستانی سپاہیوں کو کس جوش اور دلولہ کے ساتھ للکارتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا ۔۔۔ طنطنہ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا ۔۔۔ ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا
یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کیلیے ۔۔۔ ناؤ تلوار کی ہے پار لگانے کے لیے

اور آخری بند میں وہ بات بھی صاف صاف کہہ جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بے چین رہتے تھے:

مادرِ قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام ۔۔۔ خطۂ ہند کا اس جنگ میں روشن رہے نام
تیغ خوں ریز نے جس شان سے چھوڑا نیام ۔۔۔ اپنے مسکن میں اسی شان سے پائے آرام
شاعرِ گوشہ نشیں شکرِ خدا کرتا ہے ۔۔۔ جنگ ہو تم کو مبارک، یہ دعا کرتا ہے

اس سلسلہ کی آخری نظم "نالہ درد" ہے جو ۱۹۱۸ء میں کہی گئی ہے "جب کانگریس کے قدیم لیڈر اس قومی مجلس سے مجبوراً علیحدہ ہو گئے تھے"۔ نظم مختصر ہے جس میں کل تیرہ ۱۳ شعر ہیں، زبان نہایت سادہ ہے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں جن سے چکبست کے جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

رہنمائی کس کی ہوگی مجھ کو حیرت ہے یہی ۔۔۔ قافلے میں قوم کے سب پیشوا ہونے کو ہیں
آنسوؤں سے اپنے جو سینچا کیے باغِ وطن ۔۔۔ بیوفائی کے انھیں خلعت عطا ہونے کو ہیں
جن کو منزل سے زیادہ ہے ہوا کا رُخ عزیز ۔۔۔ قوم کے بیڑے کے ایسے ناخدا ہونے کو ہیں
مادرِ ناشاد روتی ہے کوئی سنتا نہیں ۔۔۔ دل جگر سے بھائی سے بھائی جدا ہونے کو ہیں

پوری نظم میں یہی فضا ہے جس سے چکبست کے دل کی غمناکی کی جھلکتی ہے۔

تین نظمیں محدود قومی نظریہ کے تحت کہی گئی ہیں، جن میں قومی مسدس ۱۹۱۱ء کی ہے جو ہندو یونیورسیٹی سے متعلق ہے اور اٹھارہ بند پر مشتمل ہے یہ نظم

۲ ستمبر ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں ہندو یونیورسیٹی کے عظیم الشان جلسہ میں پڑھی گئی تھی، پہلے ہی بند سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چکبست کی نظر میں ان لوگوں کی کتنی عزت تھی جو اس یونیورسیٹی کی تعمیر کے لیے کوشاں تھے اور چندے کی فراہمی میں مصروف رہتے تھے ملاحظہ کیجیے:

الٰہی کون فرشتے ہیں یہ گدائے سخن — صفائے قلب سے جن کی یہ بزم ہے روشن
جھکی ہوئی ہے سبھوں کی لحاظ سے گردن — ہر اک زباں پہ ہیں تعظیم اور ادب کے سخن
صفیں کھڑی ہیں جوانوں کی اور پیروں کی — خدا کی شان یہ پھیری ہے کن فقیروں کی

اس لیے کہ:

جو اپنے واسطے مانگیں یہ وہ فقیر نہیں — طمع میں دولت دنیا کی یہ اسیر نہیں
امیر دل کے ہیں ظاہر کے یہ امیر نہیں — وہ آدمی نہیں ان کا جو دستگیر نہیں
تمام دولتِ ذاتی لٹائے بیٹھے ہیں — تمھارے واسطے دھونی رمائے بیٹھے ہیں

اور اپنی قوم کے دولت مندوں پر تنقید بھی کرتے نظر آتے ہیں:

یہ قحط کیا ہے، یہ طاعون کیا ہے کیا ہے وبا — تمھاری قوم پہ نازل ہوا ہے قہر خدا
جو راہِ راست سے ہوتی ہے کوئی قوم جدا — اسی طرح اسے ملتی ہے ایک روز سزا
اسی طرح سے ہوا قوم کی بگڑتی ہے — اسی طرح سے غریبوں کی آہ پڑتی ہے

پھر انھیں مشورہ دیتے ہیں:

گناہ قوم کے دھو جائیں اب ایسا وہ کام کرو — مٹے کلنک کا ٹیکا وہ فیض عام کرو
نفاق و جہل کو بس دور سے سلام کرو — کچھ اپنی قوم کے بچوں کا انتظام کرو
یہ کام ہو کے رہے، چاہے جاں رہے نہ رہے — زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے

مسز بسنٹ اور پنڈت مدن موہن مالویہ کا ذکر بھی نہایت احترام کے ساتھ کرتے ہیں اور لوگوں کو ہندوستانیوں کی خراب حالت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ:

گھٹائیں جہل کی چھائی ہوئی ہیں تیرہ و تار — یہ آرزو ہے کہ تعلیم سے ہو بیڑا پار
مگر جو خواب سے اب بھی نہ تم ہوئے بیدار — تو جان لو کہ ہے اس قوم کی چتا تیار
مٹے گا دین بھی اور آبرو بھی جائے گی — تمھارے نام سے دنیا کو شرم آئیگی

اس لیے:

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کر دو　　فقیر قوم کے آئے ہیں جھولیاں بھر دو

دوسری نظم "دردِ دل" ۱۹۱۲ء میں کہی گئی ہے "جو لکھنو کی انجمن نوجوانانِ کشمیر کے آٹھویں سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ اس انجمن سے چکبست کو بڑی دلچسپی تھی۔ یہ نظم بتیس بند پر مشتمل ہے اور چار حصوں "تمہید"، "ترقی انجمن"، "حالت قوم اور" "نوجوانوں سے خطاب" میں منقسم ہے تمہید میں اپنا تعارف کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ لوگ اور ہوں گے جنھیں مقدر سے گلہ ہے اور جنھیں ان کی محنت کا صلہ نہیں ملا ہے میں نے تو غیب سے جو کچھ مانگا ہے وہ مجھے مل گیا ہے انھیں یقین ہے کہ :

کیا مٹائے گی بھلا گردشِ دوراں مجھ کو

اور وطن سے محبت کی سرشاری کا اظہار نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں :

دلِ مرا دولت دنیا کا طلب گار نہیں　　بخدا، خاک نشینی سے مجھے عار نہیں
مست ہوں حبِ وطن سے کوئی میخوار نہیں　　مجھ کو مغرب کی نمایش سے سروکار نہیں
اپنے ہی دل کا پیالہ پیئے مدہوش ہوں میں　　جھوٹی پیتا نہیں مغرب کی وہ مے نوش ہوں میں

اور تمہید کے آخر میں مژدہ جاں فزا سناتے ہیں :

یہ نسیم سحری آج خبر لائی ہے　　سال گذرا مرے گلشن میں بہار آئی ہے

دوسرے حصہ "ترقی انجمن" میں اس انجمن کے کام پر روشنی ڈالتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ :

میں نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے اپنے

اور اس کے اراکین کی خوبیاں اس طرح بیان کرتے ہیں :

بوئے نخوت سے نہیں یاں کے گلوں کو سروکار　　ہے بزرگوں کا ادب ان کی جوانی کا سنگار
علم و ایماں کی طراوت کا دلوں میں ہے گزار　　دھو گیے چشمۂ اخلاق سے سینوں کے غبار

رنگ دکھلاتی ہے یوں دل کی صفا یاروں میں
روشنی صبح کی جس طرح ہو مگر گلزاروں میں

اس بات کو کہ اس انجمن کے ممبران بچے سے جواں ہو گیے برجستہ اور دل نشیں لہجے میں کہتے ہیں :

جو کہ پودے تھے شجر ہو گئے ماشاء اللہ

اس خوشی کے موقع پر اُن ممبروں کا ماتم بھی نہایت غمناک لہجے میں کرتے ہیں جو اس دوران میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے :

یہ وہ گل تھے جنھیں اربابِ نظر نے رویا — بھائی نے، بہنوں نے، مادر نے، پدر نے رویا
خاک رونا تھا جو اس دیدۂ تر نے رویا — مدّتوں ان کو مرے قلب و نظر نے رویا
دل پہ کچھ داغ محبت ہیں نشانی ان کی — بچپنا دیکھ کے دیکھی نہ جوانی ان کی

اور آخر میں ”انجمن“ کو اس طرح دعا دیتے ہیں :

میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

اپنی قوم کی حالت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :

گلشنِ قوم میں ہے پیشِ نظر رنگ عجیب — فتنے جاگے ہوئے ہیں خوابِ گراں میں ہے نصیب
دل محبت سے خفا ہیں تو مروت کے رقیب — دور ہیں دل سے جو آنکھوں سے ہیں ہر وقت قریب
یا اب وہ پہلے کی محبت وہ بھلائی ہے کہاں — دل کے آئینوں میں اگلی سی صفائی ہے کہاں
دولتِ علم و ہنر میں بھی نمایاں ہے زوال — ہو رہا ہے چمنستانِ ذہانت پامال
سر میں سودا وہ نہیں جس سے میسر ہو کمال — پڑھنے لکھنے کا فقط دولتِ دنیا ہے مآل
عمر یوں علم کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے — اک تجارت ہے کہ دن رات چلی جاتی ہے

اور نصیحت بھی کرتے ہیں :

علم و اخلاق کے دامن پہ تمھارے ہے یہ داغ — جو بزرگوں نے لگایا تھا اُجڑتا ہے وہ باغ
تم کو اللہ نے بخشے ہیں وہ دل اور وہ دماغ — جس سے روشن ہو زمانہ کی ترقی کا چراغ
اک ذرا جذبۂ اخلاق کو اعلیٰ کر دو — قوم مرحوم کی تربت پہ اجالا کر دو

تیسری نظم ”نالۂ یاس“ ہے جو ۱۹۱۸ء میں کہی گئی ہے۔ جو کشمیر کی یاد میں ہے اور پُر درد ہے جس کے مطالعہ سے ان کے وطنی اور قومی جذبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زبان دلنشیں اور پُر تاثیر ہے دیکھیے ماضی کی یاد انھیں کس طرح مضطرب کرتی ہے :

وہ بھی کیا عالم تھا جب دنیا سے دل آزاد تھا — اور سب بھولے تھے ایک قصہ وفا کا یاد تھا
قوم کا سودا، وفا کا شوق، خدمت کی اُمنگ — بس انھیں دو تین کے صدقہ میں دل آباد تھا
کوفت تھی ہم کو اگر گمراہ تھا بچہ کوئی — ہم بھی خوش تھے گر کسی معصوم کا دل شاد تھا

تھی اسی رنگ محبت سے امیدوں کی بہار کیسے کیسے پھول تھے کیسا چمن آباد تھا،
ہم یہ برسوں کی محبت بھولنے والے نہیں اتنے بھائی ایک ماں کی گود نے پالے نہیں

مجموعی حیثیت سے یہ تینوں نظمیں "قومی مسدس"، "دردِ دل"، اور "نالۂ یاس"، اچھی ہیں اوران کے قومی اور وطنی جذبے کی مظہر ہیں، ان کا یہی محدود جذبہ جب اپنی حدود سے نکل گیا تو پورے ہندوستان کو محیط کر گیا ہے۔

اس حصہ کی آخری کڑی یعنی اصلاحی نظمیں صرف دو ہیں۔ دونوں نظمیں ۱۹۱۷ء کی ہیں پہلی نظم "پھول مالا"، لڑکیوں کے لیے ہے جس میں کل ۳۲ شعر ہیں، چکبست اس نظم میں ہندوستانی خواتین کو تنبیہ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ترقی اور ریفارم کے نام پر جو چیزیں لائی جارہی ہیں وہ مردوں کی "روشِ خام"، کا نتیجہ ہیں۔ انھیں وہ اختیار نہ کریں۔ چکبست کی اس نظم سے یہ بات بہت واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ وہ یورپ سے فیض اٹھانے کے خلاف نہیں تھے لیکن اس کے بدلے میں غیرتِ قومی کو مٹانا پسند نہیں کرتے تھے:

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز
رنگ و روغن تمھیں یورپ کا مبارک لیکن قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز

اس بات کو کہ مردوں نے اپنے مشرقی اخلاق کو کھو دیا ہے لیکن خواتین ایسا نہ کریں۔ وہ اپنے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے ظاہر کرتے ہیں:

نقدِ اخلاق کا ہم نل کی طرح ہار چکے تم ہو دمینت یہ دولت نہ لٹانا ہرگز

پوری نظم کا ماحصل یہ ہے کہ ہمارے ملک کی خواتین کو چاہیے کہ وہ مردوں کی طرح ہندوستانی اخلاق اور اندازِ زندگی کو نہ کھو دیں، مردوں نے انھیں کھو کر بہت کچھ کھو دیا ہے۔

"برقِ اصلاح"، اس سلسلے کی دوسری نظم ہے جیسا کہ حاشیے پر درج ہے:

"کشمیری پنڈتوں کے فرقہ میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی آگرہ میں ہوئی تھی اس اصلاح کے خیر مقدم میں یہ نظم تصنیف

کی گئی تھی ،،

گیارہ بند پر مشتمل اس نظم کی ابتدا ہی کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ چکبست کی اس موقع پر خوشی اور مسرت کا اندازہ اچھی طرح ہوئے لگتا ہے وہ اس جرأت مندانہ قدم پر مبارک باد دیتے ہوئے کہتے ہیں :

مرحبا جرأت اصلاح دلانے والو
قوم کے بار امانت کے اٹھانے والو
دل کی اجڑی ہوئی نگری کو بسانے والو
مادر ہند کی بگڑی کے بنانے والو
کیسے طوفان میں دیا ہے سہارا تم نے
خوب ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا تم نے

اور نہایت جوش کے ساتھ اپنے پر خلوص جذبات کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں :

آئیں پیران طریقت یہ تماشا دیکھیں ،
ہاں نئے دور کا اٹھتا ہوا پردہ دیکھیں
جوش اصلاح کا بہتا ہوا دریا دیکھیں
پار ہوتے ہوئے مظلوم کا بیڑا دیکھیں
دیکھ لیں دھرم کی اس قوم میں خو باقی ہے
ان رگوں میں ابھی رشیوں کا لہو باقی ہے

اور پوری نظم کے مطالعہ سے ان کی وسعت قلبی ، وسعت نظری ، اور انسانی دوستی کے جذبے کا اظہار ملتا ہے اور اوپر کی دونوں نظموں کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ وہ قوم کی برائی کی اصلاح کے خواہش مند تھے اور دوسرے کے اس قسم کے اقدام کی قدر کرتے تھے ظاہر ہے یہ سارا جذبہ ان کا حبِ قومی کی وجہہ سے تھا۔

(۳)

میرے نزدیک تیسرا حصّہ ان نظموں کا ہے جن میں شاعر نے اپنے مذہبی جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے نظمیں کہی ہیں۔ اس حصے میں صرف ۲ دو نظمیں شامل کی جاسکتی ہیں ”کرشن کنھیا ،، ”جنم اشٹمی ،، اور ”رامائن کا ایک سین ،،۔ ان دونوں نظموں پر کوئی سنہ درج نہیں ہے۔ پہلی نظم ”کرشن کنھیا ،، سترہ بند پر مشتمل ہے اس طرح کی نظمیں اردو میں زیادہ نہیں ملتی ہیں۔ چکبست نے نہایت دلنشیں انداز میں یہ نظم کہی ہے۔ بعض حصے تو بہت خوب ہیں اور ایک خاص کیفیت رکھتے ہیں ، تاریک شب کا یہ منظر ملاحظہ کیجئے :

شب تاریک کے قبضے میں ہے ایوان فلک
جھکی جاتی ہے اندھیرے میں ستاروں کی پلک
وہ ہوا ہے کہ اڑے جاتے ہیں فانوس تلک
نظر آتی نہیں بستی میں ستاروں کی جھلک

صرف جگنو ہے کہ دیوانہ صفت پھرتا ہے
شمع لے کر کبھی اٹھتا ہے کبھی گرتا ہے

یا

راہ تاریک ہے اور سر پر گرج بادل کی
دو نگڑا مینھ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی
شوخ وطرار وحسیں چھوکریاں گوکل کی
چلی آتی ہیں صراحی لیے جمنا جل کی
دل لڑکپن کی امنگوں پہ مچل جاتا ہے
کھلکھلا پڑتی ہیں جب پاؤں پھسل جاتا ہے

اور پھر اس رات کی عظمت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں جس میں کنھیا پیدا ہوئے تھے:

آج سوتی ہوئی دنیا کی ہے قسمت بیدار
سال بھر بعد وہ رات آئی ہے دل جس پہ نثار
یہی بجلی تھی، یہی ابر، یہی جوشش بہار
جب کنھیا کے جنم سے ہوئی روشن شب تار
قید خانے کی سیاہی میں وہ تارا چمکا
جس سے انسان کی ہستی کا ستارا چمکا

چکبست کی بعض باتیں اس نظم میں کس قدر صداقت پر مبنی ہیں جن سے زندگی اور اس کی سچائیوں کا پردہ چاک ہوتا نظر آتا ہے:

روح دنیا کی مسافر ہے اجل منزل ہے

پھل کے لالچ میں لگاتے نہیں نیکی کا شجر

ذرا ملاحظہ کیجیے خالق ومخلوق کے رشتے پر کس خوبی کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے:

وہی بسمل وہی جوہر شمشیر بھی ہے
شعلۂ شمع وہی ہے، وہی دلگیر بھی ہے
خود مصوّر ہے وہی اور وہی تصویر بھی ہے
وہی حاکم وہی قیدی وہی زنجیر بھی ہے
جوہری بھی ہے وہی جوہر عالی بھی وہی
پھول بھی وہی ہے وہی اس باغ کا مالی بھی ہے

مجموعی طور سے یہ نظم پاکیزہ فضا میں ڈوبی ہوئی ہے اور پُر تاثیر ہے۔

دوسری نظم ''رامائن کا ایک سین'' ہے جو طویل اور مشہور نظم ہے اور جس کا چکبست کی اہم نظموں میں شمار ہوتا ہے اس نظم میں چکبست نے خاص طور سے جذبات نگاری، پیکر تراشی اور مکالمہ نویسی کا کمال دکھایا ہے۔ اس نظم کا تعلق اگرچہ ایک مذہب کے ماننے والوں سے ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ کسی بھی مذہب وملت سے تعلق رکھنے والا اسے پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا دراصل اس میں انسانی احساسات کی

صداقتوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور درد و کرب کو اس انداز سے سمویا گیا ہے کہ وہ دلوں کو چھوئے اور مضطرب کیے بغیر نہیں رہتے۔ رام چندر جی کا ماں کے پاس جانا ملاحظہ کیجیے۔ وہ جانتے تھے کہ ماں بن باس کی خبر سن کر نہ صرف بے انتہا رنجیدہ اور مضمحل ہوگی بلکہ اس کی حالت کچھ سے کچھ ہو چکی ہوگی چنانچہ :

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

ماں کو اس حالت میں دیکھ کر وہ نہایت خاموشی کے ساتھ ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں، کچھ دیر تو یہی کیفیت رہتی ہے پھر ماں نہایت غمناک لہجے میں مخاطب ہوتی ہے :

رو کر کہا خاموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھ کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں،

یا یہ باتیں کوئی دکھی ماں ہی تڑپ کر کہہ سکتی ہے :

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

ماں کو اس قدر رنجیدہ اور کبیدہ خاطر دیکھ کر اور ان کی غمناک گفتگو سن کر رام چندر انھیں دنیا کی حقیقتوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے آلام و آزار و پریشانیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض مثالوں کی مدد سے ان کے غم و الم کو کم کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار
یہ جانتے ہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اور پھر ماں کی توجہ اس بات کی طرف دلاتے ہیں :

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام　　بعد سفر وطن کو ہم آئیں گے شاد کام

ہوتے ہیں بات کرتے ہی چودہ برس تمام　　قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام

اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں　　کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

پھر رب العالمین کی یاد دلاتے ہیں اور نہایت سادگی کے ساتھ اِس سچی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں　　دامانِ دشت دامن مادر سے کم نہیں

لیکن اس گفتگو کا رام کی ماں پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا، وہ بے حد رنجیدہ تھیں انھوں نے نہایت تلخ ہنسی کے ساتھ جواب دیا:

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر　　ہنس کر وفورِ یاس سے لڑکے پہ کی نظر

چہرہ پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر　　جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گذر

پنہاں جو بے کسی تھی وہ چہرے پہ آگئی　　جو دل کی مردنی تھی نگاہوں میں آگئی

اور پھر وہ نہایت رنج و غم کے ساتھ سفر کے لیے اجازت دیتی ہیں:

ان آنسوؤں کی قدر تمھیں کچھ ابھی نہیں　　باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل لگی نہیں

لیکن تمھیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں　　جاؤ سدھارو خوش رہو میں روتی نہیں

دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں　　پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

ماں کا یہ کہنا تھا کہ رام چندر کا دل مضطرب ہو گیا، ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا چنانچہ وہ ماں کے قدموں پر گر پڑے اور کہا کہ اگر مجھ سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے تو میرے لیے زندہ رہنے سے زیادہ بہتر مر جانا ہے اس لیے کہ:

جو بے وفا ہے مادرِ ناشاد کے لیے
دوزخ وہ زندگی ہے اس اولاد کیلیے

پھر وہ ماں کو اس طرح سمجھاتے ہیں کہ وہ بے اختیار ہو جاتی ہے اور ہندستانی ماں کی طرح مامتا کے جذبے سے مغلوب ہو کر:

سرکا کے پاؤں گود میں سر کو اٹھا لیا
سینہ سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا
گنگ و جمن کی طرح آنسو ہوئے رواں

اور :

نظم کے اختتام پر رام چندر کے بارے میں چکبست یہ خیال ظاہر کرتے ہیں :

ایسا گہر نہ تھا کوئی دسرت کے تاج میں

اور قاری کو ایک غمناک لیکن ایک عجیب پُرسکون فضا میں چھوڑ جاتے ہیں یہ کہنا بجا ہے کہ اگر چکبست رامائن کو منظوم کر دیتے اور کچھ نہ لکھتے تو یہ ان کا ہندوستان پر، اردو پر اور ہم سب پر بڑا احسان ہوتا اس لیے کہ وہ قدرت سے اس طرح کی پُردرد اور پُرتاثیر نظموں کے کہنے کا سلیقہ لے کر آئے تھے۔

(۴)

میں نے چوتھا حصہ شخصی مراثی کا قائم کیا ہے، اس حصے میں سات نظمیں آتی ہیں ان میں "ماتم یاس"، اور نشتر یاس میں عزیزوں کا ماتم ہے اور گنگا پرشاد ورما، گوپال کرشن گوکھلے، بشن نرائن ورما، بال گنگادھر تلک یہ چار شخصی مرثیے سیاسی رہنماؤں کے ہیں، ایک مرثیہ ایک ایسے شخص کا ہے جو نہ عزیز ہے نہ قومی رہنماؤں کے ہیں، ایک مرثیہ ایک ایسے شخص کا ہے جو نہ عزیز ہے نہ قومی رہنما لیکن بحیثیت انسان نہایت اچھا تھا، وطن کا خدمت گذار تھا یعنی "اقبال نرائن مسلہ داں"، اس لیے ان کا ماتم کیا گیا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ اس وقت تک شخصی مرثیے اردو میں زیادہ نہیں لکھے گئے تھے اگر اس صنف کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تاریخ بہت پرانی نہیں بلکہ غالب اور مومن سے اس کی ابتدا ہوتی ہے، مومن کا ایک مرثیہ محبوب کے انتقال پر ملتا ہے جس کے چند شعر ملاحظہ کیجیے :

دل کی طرح سے یہ بھی چلی، جاں کو کیا ہوا	دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا
سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے	کیا جانے اس کی زلفِ پریشاں کو کیا ہوا
دل میں شکن ہے زلفِ مسلسل کدھر گئی	برہم ہے حال کاکُلِ پیچاں کو کیا ہوا

یہ مرثیہ غزل کی صورت میں ہے اور آہ و نالہ کے باوجود اس قدر دردناک نہیں ہے جس کی اس مرثیہ سے توقع کی جا سکتی تھی۔ البتہ مرزا غالب نے جو دو شخصی مرثیے قلم بند کیے ہیں وہ اس سے زیادہ پُردرد اور پُرتاثیر ہیں خاص طور سے مرزا غالب کا یہ مرثیہ تو نہایت غمناک ہے دیکھیے کس درد کرب کے ساتھ مخاطب ہیں:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو کہ قیامت میں ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی — بچوں کا بھی نہ دیکھا تماشہ کوئی دن اور

محبوب کا جو مرثیہ لکھا ہے اس کے چند شعر بھی ملاحظہ کیجئے ان کے مطالعہ سے ایک خاص قسم کی کسک کا احساس ہوتا ہے:

درد سے میرے ہے تجھکو بے قراری ہائے ہائے — کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

لیکن ان مرثیوں میں وسعت پیدا نہیں ہوئی ہے، اظہار غم والم کے علاوہ کچھ نہیں پیش کیا جاسکا ہے الطاف حسین حالی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے "مرثیہ غالب" لکھ کر اُردو میں شخصی مرثیے کو بڑی بلندی، وسعت اور عظمت عطا کی ہے جس میں غالب کے انتقال پر اظہار غم کے علاوہ، ان کی مختلف قسم کی خوبیاں بھی مختلف زاویئے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دنیا، اس کے حالات اور انسانی زندگی پر گہری روشنی ڈال گئی ہے جن کی وجہ سے اُردو میں شخصی مرثیوں کی اہمیت اور قدر و قیمت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ حالی نے "مرثیہ غالب" کے علاوہ بھی کئی شخصی مرثیے لکھے ہیں لیکن اس مرثیہ کی بات بالکل الگ ہے۔

جس طرح حالی کی شاعری اور اس کے بعض موضوعات کی بازگشت چکبست کے یہاں نمایاں طور سے سنائی دیتی ہے اسی طرح شخصی مرثیہ نگاری کو بھی چکبست کی شاعری میں خاص جگہ ملی ہے چنانچہ انھوں نے عزیزوں، دوستوں اور قومی رہنماؤں کی وفات پر جو شخصی مرثیے لکھے ہیں اُردو شاعری میں ان کی بھی ایک خاص اہمیت ہے۔ پنڈت اجودھیا ناتھ جو چکبست کے عزیز تھے اور نہایت ہونہار تھے عین جوانی میں ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ۱۹۱۱ء میں انتقال کر گئے چکبست نے ان کے غم میں "ماتم یاس"

قلم بند کیا جو ۱۲۳ بند پر مشتمل ہے، اس مرثیہ کے بعض بند بہت دردناک ہیں جن سے چکبست کے شدتِ غم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

ماں کو رونا ہے کہ جاتا ہے تو جا مل کر گلے　　بھائی کہتا ہے رہوں گا کس کی چھاتی کے تلے
کہتی ہیں بہنیں کہاں منہ موڑ کر بھائی چلے　　دھیان کچھ اس کا بھی ہے جس گود میں ہم تم پلے
کچھ سہارا چاہیے اہلِ محن کے واسطے　　بھائی کی ڈھارس بڑی شے ہے بہن کے واسطے

تیری بالیں پر کھڑا ہے اور بھی اک سوگوار　　وہ عزیزوں سے سوا تیرا انیس و غمگسار
چھوڑ کر گھر بار تجھ پر جان کی اپنی نثار　　یہ محبت کا فسانہ بھی رہے گا یادگار
گو کہ باقی اب دلوں میں جذبۂ عالی نہیں　　پاک روحوں سے مگر دنیا ابھی خالی نہیں

دوسرا مرثیہ "نشترِ یاس"، ہے چکبست کے ایک عزیز تیج نرائن چکبست نے جنون کے عالم میں ۱۹۱۵ء میں خودکشی کرلی تھی، اس مرثیہ میں آہ و نالہ کم ہے اگرچہ درد کی کسک بھرپور ہے، بعض بند فکر انگیز ہیں اور حقیقتوں کا پردہ چاک کرتے ہیں:

نہ اعتبار سہی اس حیات فانی کا　　مگر امید سے ہے لطف زندگانی کا
پیام مرگ ہے غم، یاس جاودانی کا　　شباب روح کا ہے، حوصلہ جوانی کا
بشر کا دل نہ ہو زندہ تو آب و گل کیا ہے　　فقط طلسم امیدوں کا ہے یہ دل کیا ہے

ایک بند اور ملاحظہ کیجیے مثال کی مدد سے چکبست نے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے:

جب اپنی جا سے اُبلتا ہے چشمۂ کہسار　　قدم قدم پہ دکھاتا ہے جوش کی رفتار
مگر جو راہ میں حائل ہو پتھروں کا فشار　　تو یوں بکھرتا ہے قطروں میں جیسے اشک کا تار
شباب یونہی لٹاتے ہے کسی کے بسمل کا　　ستم ہے جوشِ جوانی میں ٹوٹنا دل کا

لیکن وہ چار شخصی مرثیے جو قومی رہنماؤں کی موت پر کہے گیے ہیں بڑی شہرت اور قدر و قیمت رکھتے ہیں جن کی وجہ سے شخصی مرثیہ نگاری میں چکبست کو خاص مقام حاصل ہوا ہے۔

گنگا پرشاد ورما کا انتقال ۱۹۱۲ء میں نینی تال میں ہوا تھا، اس سے پہلے ۱۹۰۱ء میں چکبست نے مہادیو گووند رانا ڈے جو کہ سیاسی رہنما تھے کی وفات پر شخصی مرثیہ

لکھا تھا، لیکن اس کا شمار ابتدائی کلام میں کیا گیا، اس لیے بعد کے کلام میں یہ پہلا شخصی مرثیہ ہے جو کسی قومی رہنما کے لیے چکبست نے قلمبند کیا ہے، جس کے پہلے ہی بند سے ان کے دلی جذبات کا اندازہ ہوتا ہے:

کس کے ماتم میں یہ سامان سیہ پوشی ہے — کچھ عجب طرح کی احباب میں سرگوشی ہے
کہیں سکتہ ہے کہیں عالمِ بے ہوشی ہے — یہ تو مجمع ہے اور اس طرح کی خاموشی ہے
کون دل سرد ہوا غم ہوا تازہ کس کا — قوم کے سامنے ہے آج جنازہ کس کا

اور ان کے جانے کا ماتم اس طرح کرتے ہیں:

بڑھ گئی شومی قسمت کی سیاہی افسوس — آ گئی شہر کے بیڑے پہ تباہی افسوس
مٹ گئی عالمِ اخبار کی شاہی افسوس — اُٹھ گیا قوم کے لشکر کا سپاہی افسوس
کون میدان سیاست میں کمر باندھیگا — قوم کے واسطے سینہ پہ سپر باندھیگا

اور چکبست اُن کی مختلف خصوصیات بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انھیں نہ ستایش کی تمنا تھی نہ شکایت کا خوف تھا وہ ملک کے عیش سے خوش اور ملک کے صدمے سے اداس ہو جاتے تھے۔ اسی لیے:

یونہی دنیا میں تجھے اہل نظر روتے ہیں — آنکھ میں اشک نہ ہو قلب و جگر روتے ہیں
آدمی کیا ہیں شجر اور حجر روتے ہیں — پھول شبنم کی طرح شام و سحر روتے ہیں
جس کو انسان بھلا دے یہ وہ آواز نہیں — یہ ہے وہ زخم جو مرہم کا طلب گار نہیں

دراصل اس غم میں شدّت اسی لیے ہے کہ قوم کا عاشق، رخصت ہوا ہے ورنہ اس قسم کے غموں سے تو لوگ دو چار ہوتے ہی رہتے ہیں:

یوں تو دنیا میں ہمیشہ سے ہے مرنے کا چلن — اپنے بچوں کو نگلتی ہے زمین کی ناگن
داغ دیتا ہے مگر جب کوئی دلسوز وطن — اس کے صدمے سے لرزتا ہے یہ ایوانِ کہن
چاندنی رات میں جس وقت ہوا آتی ہے — قوم کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

دوسرا مرثیہ گوپال کرشن گوکھلے کا ہے جن کی حیثیت بھی نمایاں قومی لیڈر کی تھی، ۱۹۱۵ء میں ان کا انتقال ہوا تھا یہ مرثیہ دس بند پر مشتمل ہے۔ یہاں پہلے بند سے غم کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے — وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے

صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے
زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے
حبیب قوم کا دنیا سے یوں رواں نہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

اور ان کی وطن کی خدمات کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ
سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تیری عمر کا فسانہ ہے

ذرا گوکھلے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیے:

حدیث قوم بنی تھی تری زبان کیلیے
زباں ملی تھی محبت کی داستان کیلیے
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لیے
کہ تیرے ہاتھ میں فانوس تھا اذاں کیلیے
وطن کی خاک تیری بارگاہ اعلیٰ ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا شوالہ ہے

موت سے کس کو رستگاری ہے لیکن یہ موت کچھ اور ہے:

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو
مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو
مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

تیسرا مرثیہ بشن نرائن در متخلص بہ ابر کا ہے جن کے بارے میں چکبست نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ادیب جنوری ۱۹۱۰ء میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا:

پنڈت بشن نراین صاحب در کی زندگی ایک ایسے مرد قانع کی زندگی ہے جس نے علم کی دولت اور ملک و قوم کی خدمت کو ذریعہ نجات سمجھا اور آزاد خیال اور بلند نظری کو انسانی شرافت کا معیار خیال کیا،،[1]

یہ مرثیہ سولہ[16] بند پر مشتمل ہے اور ان کی وفات پر ۱۹۱۶ء میں لکھا گیا ہے جس میں غم کا اظہار ضرور ہے لیکن اس میں وہ شدت اور اضطراب نہیں جو عام طور سے مرثیوں کی جان ہوتے ہیں پہلے بند ہی سے مرثیے کی فضا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

---

[1] مضامین چکبست ص ۲۹۲

صدمۂ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زباں دل کا سہارا نہ رہا
گلشن علم وادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلع دانش و بینش کا ستارا نہ رہا
سب یہ غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

غالب نے کہا ہے ،، آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا ،، چکبست ،، انسان ،، ہونے کو آدمی کے لیے معراج متصور کرتے ہیں :

دولت علم و ہنر سے نہیں دنیا خالی
بزم عالم کی یہ رونق نہیں جانے والی
پر ہے کمیاب وہ جوہر وہ سرشتِ عالی
آدمیت کی بنا جس نے ازل میں ڈالی
کچھ بڑی بات نہیں فاضلِ دوراں ہونا
آدمی کے لیے معراج ہے انساں ہونا

اور وہ آدمی انھیں بشن نرائن در میں مل جاتا ہے چنانچہ ان کی موت پر انھیں اس آدمی کے کھونے کا صدمہ نمایاں طور پر ظاہر ہو جاتا ہے ۔

آدمیت کی یہ تصویر مٹی جاتی ہے
حسن اخلاق کی تدبیر مٹی جاتی ہے
جذبۂ خیر کی توقیر مٹی جاتی ہے
ہم مٹے جاتے ہیں تقدیر مٹی جاتی ہے
دل مایوس محبت کا عزا خانہ ہے
اپنی آنکھوں میں یہ دنیا نہیں ویرانہ ہے

وہ بشن نرائن در کی صفات بیان کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوتے ہیں :

تجھ کو معلوم نہ تھا دولت دنیا کیا ہے
حرص کیا شے ہے زر و مال کا سودا کیا ہے
خود پرستی کا زمانے میں تقاضا کیا ہے
عیش کیا چیز ہے راحت کی تمنا کیا ہے
تو نہ سمجھا کبھی غیروں کے مدد کے غم میں
اپنی راحت کا بھی سامان ہے اس عالم میں

یا

شہرۂ عالم کو سمجھا نہ لیاقت کا صلہ
نکتہ چینوں سے شکایت نہ رقیبوں سے گلا
دیدۂ غیر میں کھٹکی نہ طبیعت کی جِلا
تو زمانہ سے مہِ نو کی طرح جھک کے ملا
عاجزی دل کی جھلکتی رہی پیشانی سے
تو وہ دریا تھا جو واقف نہیں طغیانی سے

دنیا میں ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے کچھ بد خصلت اور بد نصیب لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا وجہ مخالفت کرتے ہیں چنانچہ در کو ایسے کم ظرف لوگوں سے بھی واسطہ پڑا ہے :

بد نصیب ایسے ہیں تجھ سے جو بیزار رہے
آ کے دنیا میں فقط تیرے دل آزار رہے

ایسے بے درد زمانہ کے گنہہ گار رہے
مگر احسان سے تیرے نہ سُبک بار رہے
ان کو شرمندہ کیا تونے محبت کر کے
خود گنہہ گار ہوئے تجھ سے عداوت کر کے

پورا مرثیہ ایک خاص فضا اور ایک خاص سنجیدہ اور پُر درد لہجہ میں ہے، پڑھتے جائیے اور ہلکی کسک محسوس کرتے جائیے البتہ بعض مصرعے اور شعر، زندگی اور اس کی صداقتوں اور اس کے برتنے کے طریقوں سے بڑی خوبی کے ساتھ آگاہ کرتے ہیں:

آدمیت کے لیے معراج ہے انساں ہونا

تو زمانہ سے مہہ نو کی طرح جھک کے ملا

رنگ دنیا سے رہا عالم فانی میں جدا
جیسے لہروں سے کنول رہتا ہے پانی میں جدا

یوں ہوا کرتے ہیں یارانِ کہن دل سے جدا
جیسے پتوں سے گرا دیتی ہے پانی کو ہوا

زندگی یوں تو فقط بازی طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے

اور چوتھا مرثیہ بال گنگادھر تلک کا ہے یہ مرثیہ مختصر ہے اور آٹھ بند پر مشتمل ہے اس میں بھرپور غم کی کیفیت ضرور ہے لیکن کہیں بھی آہ و نالہ نہیں ہے، دیکھیے کن پُر شکوہ الفاظ میں چکبست ان کی موت پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں:

اُٹھ گیا دولتِ ناموس وطن کا وارث
قوم مرحوم کے اعزازِ کہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی شیر دکن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث
تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

قوم میں ان کی حیثیت نگہباں کی تھی لیکن دشمن ان سے لرزتے تھے۔ اب اہل وطن ان کو یاد کر کے آنسو بہائیں گے۔ یہاں بھی لہجہ کا وقار ملاحظہ ہو:

تھا نگہبان وطن دبدبۂ عام ترا
نہ ڈگیں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ عالم تھا کا ترا
نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا

یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے بندۂ رسم جفا چین سے اب سوئیں گے

———— اور آخری بند میں زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ اپنے محبوب رہنما کی آخری رسم ادا کرنا چاہتے ہیں:

لاش کو تیری، سنواریں نہ رقیبان کہن ہو جبیں کے لیے صندل کی جگہ خاک وطن
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن
شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی چاہیے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

ان چار قومی رہنماؤں کے مرثیوں کے علاوہ ایک شخصی مرثیہ اور ہے جو "اقبال نرائن مسئلہ دان"، کی موت پر لکھا گیا ہے۔ اقبال نرائن کی حیثیت لیڈر کی نہیں تھی بلکہ قوم کے ہمدرد اور خدمت گذار کی تھی، چکبست کا یہ مرثیہ سب سے مختصر یعنی کل سات بند پر مشتمل ہے جس میں متوفی کی خصوصیات یعنی اُن کی بامروت آنکھیں نورانی چہرہ اور گفتگو کے طرز کو یاد کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ خود نمائی اور خود پرستی کی خرابیوں سے پاک تھے ظاہر ہے یہ ایسی خوبیاں ہیں جن سے انسان کی بڑائی نمایاں ہوتی ہے اور جن کو اپنا کر قوم کے افراد قوم کی تعمیر کر سکتے ہیں دو بند ملاحظہ کیجیے:

نہیں ہٹتی نگاہوں سے تیری تصویر نورانی وہ چشم بامروت وہ کشادہ لوح پیشانی
ہنسی کا سحر لب پر، گفتگو کا طرز لاثانی نہ ابرو پر شکن لائی کبھی، دل کی پریشانی
ابھی کچھ رات باقی ہے یہ قدرت کا اشارہ تھا جھلکتا دور ہی سے صبح پیری کا ستارہ تھا

سبق سیکھا نہ تھا فطرت نے تیری خود نمائی کا لب خاموش کو دعویٰ نہ تھا رنگیں نوائی کا
نہ عادت خود پرستی کی، نہ سودا پیشوائی کا جھلکتا تھا مگر جوہر طبیعت کی صفائی کا
حلاوت تھی وطن اور قوم کی خدمت سے جینے میں امانت تھی خدا کی اک دلِ پُر درد سینے میں

اس مرثیہ کا آخری بند بہت مؤثر ہے کوئی صاحب نظر ہی ان خیالات کا اظہار کر سکتا ہے:

نہ دولت یاد آتی ہے نہ غم ہوتا ہے ثروت کا جسے روتی ہے دنیا ہے وہ جوہر آدمیت کا
مآلِ زندگی ہے لاش پر آنسو محبت کا دعائے خیر مرنے پر صلہ ہے حسن خدمت کا
سفر اس روح کا بھی طے ہو رحمت کے اجالے میں "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ چکبست کے تمام شخصی مرثیے، زبان، بیان، انداز، موضوعات، اثر و تاثیر ہر اعتبار سے اپنی ایک خاص اہمیت اور قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف اظہار غم نہیں ہے بلکہ اصلاح قوم اور تعمیر وطن بھی ہے بلاشبہ ان مرثیوں کا اردو شاعری میں نمایاں مقام ہے۔

(۵)

میں نے پانچواں حصہ ان نظموں کے لیے مخصوص کیا ہے جو قدرتی مناظر اور عمارت سے متعلق ہیں، اس حصے میں میرے نزدیک صرف ۲ دو نظمیں "سیر دہرہ دون" اور "آصف الدولہ کا امام باڑہ" ہیں

"سیر دہرہ دون" اکتالیس ۴۱ شعروں پر مشتمل ہے، اور سادہ، سلیس اور رواں دواں زبان میں ہے۔ پہلے شعر ہی سے دہرہ دون کی دلکشی کا اندازہ ہونے لگتا ہے:

عجیب خطہ دلکش ہے شہر دہرہ دون، یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون

مختلف مناظر اور تشبیہات کی ندرت ملاحظہ کیجیے:

لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزہ کا بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا
اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن میں
گھنے درخت، بڑی جھاڑیاں زمیں شاداب لطیف و سرد ہوا، پاک و صاف چشمہ آب
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں ٹھہر گئی ہے بہار آکے اس گلستاں میں

پہاڑوں کو دیکھ کر یہ کہنا:

یہ بل زمین کے تیوری پہ آ گیا کیا؟

ندی کو ناگ سے تشبیہہ دینا:

سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

نظم میں ندرت، لطف اور وقار پیدا کرتے ہیں، مجموعی حیثیت سے نظم اچھی ہے۔

اس حصہ کی دوسری نظم "آصف الدولہ کا امام باڑہ" لکھ کر چکبست نے نہ صرف وسیع القلبی کا ثبوت پیش کیا ہے بلکہ فن تعمیر سے اپنی گہری دلچسپی کا بھی اظہار کیا ہے۔ یہ نظم تیئس ۲۳ شعر (دو بند) پر مشتمل ہے امام باڑہ کے متعلق چکبست

کا خیال ہے کہ :

جس کی صفت کا نہیں صفحۂ ہستی پہ جواب

اس لیے وہ سیاحوں کو مشورہ دیتے ہیں :

دیکھ سیاح اسے رات کے سناٹے میں

منہ سے اپنے مہِ کامل نے جب الٹی ہو نقاب

کبھی ان کی حیران نگاہوں کو محسوس ہوتا ہے :

ڈھل کے سانچے میں زمیں پر اُتر آیا ہے سحاب

ان کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ امام باڑہ :

دور سے عالمِ تصویر نظر آتا ہے

اس عمارت کی بعض خوبیاں وہ اس طرح پیش کرتے ہیں :

شوکت و شانِ عمارت کی خبر دیتا ہے — پردۂ شب کے سرکنے پہ سحر کا آغاز

وہ سپیدی سحر نور کی ہلکی ، ہلکی ، — آشیاں چھوڑ کے جب کرتے ہیں طائر پرواز

ایسے عالم میں وہ کہرے سے ابھرنا اس کا — جیسے موجوں کے تلاطم سے نمایاں ہو جہاز

اس طرح چکبست نے اس عمارت کی تصویر الفاظ کے ذریعہ شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی ہے اور وہ بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

(۶)

چھٹا اور آخری حصہ ایسی نظموں پر مشتمل ہے جس کے لیے میں نے متفرقات کا عنوان قائم کیا ہے اس حصے میں مندرجہ ذیل نظمیں آتی ہیں ۔

معذرت ، یادگار بابو گنگا پرشاد ، جلوہ معرفت (فلسفہ جدید) قطعہ گائے

پہلی نظم "معذرت" ، ۱۹۱۷ء میں متھرا میں اپنے ایک دوست کی شادی میں شریک نہ ہونے پر کہی تھی ، اس میں کل اٹھارہ شعر ہیں ، جس میں اپنے دلی تاثرات اس طرح پیش کرتے ہیں :

میں یہاں ، دل ہے وہاں جسم یہاں جان وہاں — پھر رہا ہے نگہ شوق میں شادی کا سماں

یا جو خوشی تم کو ہے وہ آب و ہوا میں ہے بسی — لہر جمنا میں وہی ہے وہی پھولوں میں ہنسی

پھر دعا دیتے ہیں:

شوق کے پھول محبت کی ہوا میں کھل جائیں
جس طرح راگ سے لے ملتی ہے دل یوں مل جائیں

اس نظم کی لے دھیمی ہے لیکن بعض اشعار خلوص اور محبت کے پیکر ہیں۔

دوسری نظم "یادگار بابو گنگا پرشاد ورما ہے" ہے "لکھنؤ میں بابو گنگا پرشاد ورما کی یادگار میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے اس کتب خانہ کی نو تعمیر عمارت کا افتتاحی جلسہ زیر صدارت ہز اکسلنسی سر ویلیم میرس بہادر قرار پایا تھا۔ یہ نظم اسی موقع پر پڑھی گئی تھی"[1]

مختصر سی یہ نظم پانچ شعر پر مشتمل ہے معلوم نہیں "صبح وطن" کے حصہ سوم لوحہ جات میں اسے کیوں شامل کیا گیا ہے اس عمارت کے متعلق چکبست کا خیال ہے:

قوم کے جذبہ اخلاص کی تصویر ہے یہ
جس کی بنیاد دلوں میں ہے وہ تعمیر ہے یہ

ظاہر ہے کہ یادگار اخلاص کے تحت ہی قائم کیے جاتے ہیں۔ نظم میں چکبست نے اس کی افادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اس کتب خانہ اور قیام گاہ سے لوگ کس طرح فائدہ اٹھائیں گے۔ چکبست کو قوم سے والہانہ محبت تھی اس لیے ہر قومی کام ان کے لیے مسرت کا باعث ہوتا تھا۔

تیسری نظم "جلوۂ معرفت" (فلسفہ وید) ہے جو "ایک دوست کی فرمائش سے ایک مذہبی کتب خانہ کی لوح پر کندہ ہونے کے لیے تصنیف کی گئی تھی" اس لیے اسے بہت طویل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس میں کل تیرہ ۱۳ شعر ہیں نظم اچھی ہے آخری سات شعر بہت خوب ہیں ملاحظہ فرمائیے:

عین کثرت میں یہ وحدت کا سبق ویدمیں ہے
ایک ہی نور ہے جو ذرۂ خورشید میں ہے

جس سے انسان میں ہے جوش جوانی پیدا
اسی جوہر سے ہے موجوں میں روانی پیدا

رنگ گلشن میں فضا دامنِ کہسار میں ہے
خون رگِ گل میں ہے نشتر کی خلش خار میں ہے

تمکنت حسن میں ہے جوش ہے دیوانے میں
روشنی شمع میں ہے سوز ہے پروانے میں

---

[1] صبح وطن: برج نرائن چکبست ص ۲۶ / حاشیہ

رنگ و بو ہو کے سمایا وہی گلزاروں میں ابر بن کر وہی برسا کیا کہساروں میں
شوق ہو کر دل مجذوب پہ چھایا ہے وہی درد بن کر دل شاعر میں سمایا ہے وہی
نور ایمان سے جو پیدا ہو صفا سینے میں عکس اس کا نظر آتا ہے اس آئینے میں

بارہ شعر پر مشتمل ایک قطعہ بھی ہے جس میں ”پنڈت اقبال نرائن گرٹو“ کا ایک اہم واقعہ دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پنڈت اقبال نرائن گرٹو نے سنٹرل ہندو کالج بنارس کی خدمت کے لیے تن من دھن سے اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا جس پر ایک بزرگ کو بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ وہ اسے ”کارِ احسن نہیں گرٹو صاحب کا لڑکپن سمجھ رہے تھے، ان کا خیال تھا:

خدمت قوم تو اک شغل ہے بے کاروں کا یاں جو مفلس ہیں مبارک رہے انکو یہ چلن

جسے سن کر برج نرائن چکبست کو استاد کے اس شعر کی یاد آ گئی:

اے کہ آگاہ نئی حالتِ درویشاں را تو چہ دانی کہ چہ سودا و سرشت ایشاں را

اس طرح نہایت خوبصورتی کے ساتھ وہ گرٹو صاحب کے جذبہ خدمت خلق کی تائید اور اپنے دوست کی تردید کر جاتے ہیں۔

میرے نزدیک متفرقات میں ان کی نظم ”گائے“ بھی شامل کی جا سکتی ہے۔ جس میں انھوں نے ”گائے“ اور اس کی ہماری زندگی میں جو کچھ اہمیت ہے اسے بتانے کی کوشش کی ہے۔ زبان سادہ، خیال سادہ اور انداز سادہ ہے ملاحظہ کیجیے:

تن سے تیرے ہے عیاں نرمیِ دل کا جوہر جوڑ بند ایسے کہ سانچے میں بنے ہیں ڈھل کر
رنگ کالا ہو کہ اجلا ہو یہ کہتی ہے نظر بند را بن کی وہ ہے شام یہ متھرا کی سحر
کنگرے سے یہ نہیں چہرہ نورانی پر تاج قدرت نے سجایا ہے تیری پیشانی پر

اور اس کی موہنی صورت کے دل پر نقش ہونے کا اعلان اس طرح کرتے ہیں:

نقش ہے دل پہ میرے موہنی صورت تیری خوب دنیا کے شوالے میں ہے صورت تیری

ذرا ملاحظہ کیجیے یہ بند جس کے ہر ہر لفظ سے وہ گائے کو کس حد تک پسند کرتے تھے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار | بے پیئے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار | وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کا نکھار
ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلتا تیرا | کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

گائے ہمیں دو طرح سے فائدہ پہنچاتی ہے ایک دودھ دے کر:

نام جس کا ہے محبت وہ ہے ایمان تیرا | کوئی ہو سب کے لیے فیض ہے یکساں تیرا
زندگی کے لیے محتاج ہے انساں تیرا | کون بیمار نہیں، بندہ احساں تیرا

اور اس کے بچھڑے کھیتوں میں ہل چلا کر ہماری غذا اناج کی صورت میں فراہم کرتے ہیں:

تیرے بچوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار | اپنی گردن پہ لیا پرورش قوم کا بار
نظر آتی ہے جو، ہر فصل میں کھیتی تیار | ہے یہ سب ان کے لہو اور پسینے کی بہار
اُن کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا | ہند کی خاک اگلتی نہ خزانہ اپنا

——— انھیں خصوصیات کی وجہ سے چکبست یہ کہنے پر مجبور ہیں:

ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر مجھے تیرا سایا

مجموعی طور سے یہ نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھی ہے اور چونکہ اردو میں اس طرح کی بہت زیادہ نظمیں لکھی نہیں گئی ہیں اس لیے اہم ہے۔

چکبست کے مندرجہ بالا کلام کے علاوہ دو نظمیں اور ہیں ایک "ندرانۂ روح"، اور دوسری ظریفانہ نظم "لارڈ کرزن سے چھیڑ" طنزیہ اور ظریفانہ نظم ہے۔

"جو منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ کے حسب فرمایش تصنیف کی گئی تھی اور اودھ پنچ میں شائع بھی ہوئی تھی، لارڈ کرزن نے کلکتہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کے موقع پر ایک تقریر فرمائی تھی، جس میں ہندوستانیوں کی تہذیب و اخلاق پر سخت اور ناجائز حملہ کیا تھا [1]"

یہ نظم طویل ہے اور ترپن ۵۳ شعر پر مشتمل ہے جس میں بڑی جرأت مندی اور بے باکی کے ساتھ چکبست نے لارڈ کرزن پر لعن طعن کیا ہے۔ یہ ہمت کسی عاشق وطن ہی

---

[1] صبح وطن: برج نرائن چکبست ص ۲۰۸

میں پائی جا سکتی ہے، اس میں ظرافت کم ہے طنز سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

لیجیے سامنے میرے ہے شبیہہ کرزن — رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ
سرخ غصہ سے، زرد کبھی صدمہ سے — خوف کے مارے کبھی رنگ میں نیلاہٹ
آئے ہیں آپ تو حضرتِ کرزن سنیے — آپ اگر منھ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی منھ پھٹ
آگیا طیش مجھے دل کا نکالوں گا بخار — صاف کہتا ہوں نہیں بات میں اپنی بنوٹ
مانیے گا نہ برا آدمی ہیں آپ شریف — عالمِ نشہ میں بک جاؤں اگر کچھ سٹ پٹ
ہاں یہ کیوں آپ کے گم ہو گئے ہیں ہوش و حواس — کنووکیشن میں یہ دکھلائی ہے کیا جھلاہٹ
گل فشانی کے عوض دور کیا دل کا بخار — خوب پھینکا سر احباب پہ کوڑا کرکٹ
دیں صلاحیں ہمیں کس رنگ کی ماشاء اللہ — خوب ہم جانتے ہیں آپ ہیں جیسے نٹ کھٹ
گالیاں کس لیے در پردہ سنائیں ہم کو — ناچنے نکلے تو پھر منھ پہ یہ کیسا گھونگھٹ
یاد رہ جائے گی لیکن ہے وہ ٹھوکر کھائی — توسنِ طبع کو اب پھر نہ اڑانا سرپٹ

. . . .

یا — یہی اقرار یہی قول یہی وعدہ تھا — او سخن ساز، دغاباز، فسونگر نٹ کھٹ

لیکن یہ لہجہ بھی قابل غور ہے:

میرے مولا میری بگڑی کے بنانے والے — تو ہی تقدیر اب اس خطۂ بیکس کی پلٹ
شاہ اڈورڈ کا اقبال بڑھا دنیا میں — جس پہ سر پھوڑتے ہیں ہم وہ ہے اسکی چوکھٹ

یہ نظم اپنا منفرد مقام اور لہجہ رکھتی ہے اور چکبست کی وطن کے ساتھ شدت کی محبت اور اس کے مخالف سے شدید نفرت کا اظہار کرتی ہے۔

چکبست کا شمار اردو کے نمایاں شاعروں میں ہے وہ اگرچہ اقبال کے ہم عصر تھے لیکن حالی اور اقبال کی درمیانی کڑی محسوس ہوتے ہیں، انھوں نے حالی کی شاعری، ان کی حب الوطنی، اصلاح پسندی اور دردمندی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور چونکہ وہ وکیل زیادہ تھے اور شاعر کم اس لیے اردو شاعری کو بہت کچھ نہیں دے سکے۔ پھر عمر نے بھی بے وفائی کی، اس وجہہ سے بھی وہ اس میدان میں زیادہ غور و فکر نہ کر سکے پھر بھی انھوں نے

جو کچھ دیا ہے اس کی ہم قدر کرتے ہیں۔

زبان سادہ، سلیس، رواں دواں شیریں اور کہیں کہیں پُر شکوہ ہے، ہندی کے الفاظ شکتی، ودّیا، ماتا، ست پا کھنڈ، اُپکار، آریہ ورت بھی جا بجا نظر آتے ہیں لیکن چکبست کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے انھیں نہایت فنکاری کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں، رانا، ہری سنگھ کے ساتھ کنس، ارجن، بھیشم اور انگد کا بھی ذکر ملتا ہے اس طرح انھوں نے اپنی شاعری میں نئے لفظوں اور تلمیحوں کو استعمال کر کے ادب میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کا مستحکم اقدام ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری انیس، حالی اور اقبال سے متاثر ہے لیکن ان کی اپنی انفرادیت اردو شاعری میں ان کو نمایاں مقام دلانے میں کامیاب ہوئی ہے۔

(پنڈت برج نراین چکبست نمبر فروغ اردو لکھنو فروری مئی ۱۹۷۶ء)

علامہ سید سلیمان ندوی ؒوادیِ شاعری میں

ہندوستانی علماء میں علامہ سید سلیمان ندوی کی شخصیت اس لیے منفرد سمجھی جاتی ہے کہ وہ بیک وقت نامور مورخ، مستند محقق، معتبر ناقد، قابل قدر سیرت نگار، جید عالم، ماہر اسلامیات، روشن خیال معلم، محترم مدیر ماہر لسانیات، معروف لغت نویس، بلند مرتبہ شخصیت نگار سچے عاشق رسول، صوفی منش اور ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپاہی کی حیثیت سے جانے جاتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی تصنیف وتالیف کے ذریعے ملک وملّت کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی، اور زندگی کے آخری لمحے تک اس راہ سے سرمو پیچھے نہیں ہٹے تھے، چنانچہ ان کی علمی، ادبی اور اسلامی خدمات کی وجہ سے عالم اسلام میں وہ خوب خوب چمکے اور نمایاں عزت اور شہرت کے مالک بنے، مشرق ومغرب کے علماء صلحا اور اہل کمال نے ان کو ہمیشہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اہل نظر اور صاحب خبر نے ان کی شخصیت اور خدمات کا جائزہ لینے کے لیے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھائے، لیکن یہ بات بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ ان میں کسی نے بھی ان کی شاعری کی طرف خاص توجہ نہیں، کچھ حضرات نے اپنی تحریروں میں سرسری اس طرف ضرور اشارے کیے ہیں لیکن ان تحریروں کے ذریعے سید صاحب کی شاعری سے نہ تو پوری واقفیت پیدا ہوتی ہے کہ کیا شاعری تھی اور نہ ہی آگاہی ہوتی ہے کہ مختلف منزلوں میں اس نے کن کن پہلوؤں کو اپنایا اور کیا کیا رنگ وروپ اختیار کیا۔ اس طرف رجوع نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خود سید صاحب اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے بس حالات اور کیفیات سے مجبور ہو کر کچھ کہہ دیا کرتے تھے، ابتدا میں اخبارات یا رسائل میں چھپنے کے لیے بھیج بھی دیا کرتے تھے لیکن بعد میں اشاعت سے بھی گریز کرنے لگے تھے البتہ کبھی

کبھار نجی محفلوں میں لوگوں کے اصرار پر اپنا کلام سنا دیا کرتے تھے یا بعض دوستوں کو خطوط کے ذریعہ پہنچا دیا کرتے تھے، چنانچہ ایسی صورت میں ان کا شعری سرمایہ بہت مختصر رہا، حالانکہ آج ان کی شاعری کا جائزہ لینے سے محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ اس راہ پر مستقل مزاجی سے چلتے رہتے تو بہت دور تک چلے جاتے اور ایک قیمتی سرمایہ سے اُردو ادب کے شعری خزانے میں اضافہ کرتے۔ اس لیے کہ وہ شعر کہنے کی صلاحیت قدرت سے لے کر آئے تھے۔ میں جب غور کرتا ہوں کہ خود ان کے خاندان میں کسی نے شاعری کی طرف توجہ نہیں کی، نہ ہی ان کے وطن دسنہ میں جس نے ادبار، علمار، فضلار، صلحا اطبا، منجم اور دوسرے دنیاوی علوم میں صلاحیت رکھنے والے حضرات پیدا کیے معروف شاعر کبھی نہیں پیدا کیا، نہ وہاں بظاہر کبھی شعر و شاعری کا چرچا رہا، کبھی کبھار کسی کسی ضرورت کے تحت یا کسی احساس سے مغلوب ہو کر کسی نے کوئی نظم یا چند اشعار کہہ دیے ہوں تو یہ الگ بات ہے پھر خاندان میں بھی کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کی توجہ اس طرف دلاتا اور اُن میں شاعری سے دلچسپی پیدا کرتا۔ اس کے باوجود وہ شاعری کی طرف رجوع ہوئے تو میرے نزدیک یہی بات میرے اس خیال کو تقویت پہنچاتی ہے کہ اُن کے اندر شعر گوئی کی صلاحیتیں قدرت سے ودیعت ہوئی تھیں، جسے دسنہ کی مکتبی زندگی میں بیت بازی کے شوق نے آنچ دی اور انھیں شعر گوئی پر مائل کیا جس کی طرف مولانا ابوظفر ندوی نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

> "علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں دو پارٹیاں تھیں، جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور ان کے مشیر خاص مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی تھے اور دوسرے کے مولوی محمد قاسم صاحب . . . . اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہو گیا اور ہزاروں اشعار اُن کو زبانی یاد ہو گئے . . . .

وہ آگے لکھتے ہیں:

> . . . . چونکہ بیت بازی میں حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کر سکتے تھے، اس لیے علامہ موصوف کو تقطیع کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی، جس سے ان کو فن عروض پر اس قدر عبور ہو گیا تھا کہ علمار میں اس کی مثالیں

کم ہوں گی۔ ؎

دسنہ کے بعد اُن کا تعلیمی سلسلہ پہلے اسلام پور، پھر پھلواری شریف میں جاری رہا، جہاں ایک بار پھر انھیں بیت بازی میں حصہ لینے کا موقع ملا، یہاں قوالی کی محفلیں بھی جمتی تھیں جس کی وجہہ سے پھلواری شریف میں شعر فہمی اور شعر گوئی کا عام مذاق پیدا ہو گیا تھا، سید صاحب بھی اس سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکے، وہ بھی قوالی کی محفلوں میں شریک ہونے لگے، جس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی دلچسپی شعر و شاعری سے بڑھتی گئی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا اس لیے کہ پھلواری شریف میں قیام کا زمانہ ۱۸۹۹ء میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت ان کی عمر مشکل سے پندرہ سال کی ہوگی۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ کے لیے دربھنگہ گئے اور پھر فروری ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ پہنچے۔ جہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اُن کا داخلہ ہو گیا۔ یہیں سیّد صاحب کو شعر و شاعری سے دلچسپی لینے کا خوب موقع ملا۔ اس لیے کہ لکھنؤ کے شعری ماحول کی وجہہ سے ندوہ کے طلبہ میں شعر گوئی سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اور دارالعلوم میں طلبہ کی شعری محفلیں جمنے لگی تھیں، ان کے مشاعرے بھی منعقد ہوتے تھے، کچھ طلبہ ندوہ سے باہر نکل کر شہر کے مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ جو شعری ذوق سید صاحب میں ان کے وطن دسنہ میں پیدا ہوا تھا اور جس کی آبیاری پھلواری شریف میں ہوئی تھی اس نے شعر گوئی کی طرف انھیں متوجہہ کر دیا۔ سیّد صاحب نے اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

> "میں نے شروع ہی میں اپنے ایک جرم کا جس کو میں چھپاتا رہا، ہلکا سا اقبال کر لیا یعنی شعر و سخن کا ذوق۔ میں نے جب آنکھ کھولی تو ملک میں امیرؔ و داغؔ کے معرکے تھے، میرے ایک استاد شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس دارالعلوم جو جنرل عظیم الدین خاں کے زمانے میں رامپور میں رہے تھے اور وہاں امیر احمد صاحب مینائی کی صحبت برسوں اٹھائی تھی۔ وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا کرتے تھے اور

؎ بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات: ابوظفر ندوی: معارف سلیمان نمبر (۱۹۵۵ء) ص ۹۴

ان کے شعر سناتے تھے۔ ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانکپوری جواب نواب فصاحت جنگ سے بھی مخاطب ہیں ان کے بڑے صاحبزادے مولوی صدیق صاحب میرے ساتھ دارالعلوم ندوہ میں پڑھتے تھے۔ ان کے ذریعہ سے امیر کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گذریں اور دل میں امیر مرحوم کی قدر و منزلت نے گھر کر لیا۔ ان کا دیوان مراۃ الغیب اکثر مطالعہ میں رہتا۔ دارالعلوم میں لڑکوں کے مشاعرے ہوتے تھے غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ ایک صاحب داغ کا دم بھرتے تھے اور مجھے امیر مرحوم کی پیروی کا دعویٰ تھا"۔ [۲]

چنانچہ ندوہ کے اس زمانے کے طلبہ جو شاعری سے شغف رکھتے تھے اور مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے ان میں مولوی رکن الدین یکتا، مولوی ظہور احمد وحشی شاہجہانپوری، مولوی عبدالغفور شرر اور مولوی عبدالسلام شمیم کے نام خاص طور سے لیے جا سکتے ہیں۔ [۳]

سید صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور اپنا کلام سناتے تھے۔ ایک مشاعرہ کا تذکرہ مولانا ابوظفر ندوی صاحب نے اس طرح کیا ہے:

"وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور اپنی غزل بھی سناتے تھے ایک مرتبہ ایک مشاعرہ کی خبر شام کو ملی، رات کو مشاعرہ تھا، غزل کہنے کی کوشش کی اور صرف ایک شعر کہنے پائے تھے کہ احباب آ گئے اور ان کے ساتھ چل پڑے، اس زمانے میں وہ علی گڑھ نما پائجامہ، کرتا یا کف دار قمیص، شروانی، چشمہ اور ترکی ٹوپی، استعمال کرتے تھے اور ہاتھ میں چھڑی لے کر باہر نکلتے تھے اسی شان سے مشاعرے میں پہنچکر بیٹھ گئے۔ ان کی صورت، شکل اور لباس دیکھ کر شمع ان کے سامنے بھی آئی، پہلے تو بہت پریشان ہوئے لیکن انتقال ذہن نے پریشانی سے بچا لیا، انھوں نے یہ معذرت کی کہ مجھے مشاعرے کی مطلق خبر نہ تھی، ابھی احباب

---

[۲] آپ بیتی نمبر نقوش لاہور جون ۱۹۶۴ حصہ اول ص ۲۷۹ [۳] حیات سلیمان: شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۱۸

نے اطلاع دی فوراً اٹھا، چلا آیا البتہ ایک شعر ذہن ہی آیا ہے۔
وہ عرض کرتا ہوں:

سر سے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی　　　حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی

یہ شعر لکھنو کے رنگ کا تھا۔ خوب داد ملی ۵۶

اس طرح ندوہ میں سید صاحب کی غزل گوئی نشو دنما پاتی رہی اور مقبولیت حاصل کرتی رہی شعر گوئی کا یہ سلسلہ ۱۹۴۹ء تک پہنچتا ہے اس دوران میں شعر گوئی میں کمی ضرور پیدا ہوئی لیکن ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہوئی۔

میں نے سید صاحب کی غزل گوئی کے زمانے کو تین دور میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور طالب علمی کے زمانے کا، ۱۹۰۷ء تک۔ دوسرا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۱ء تک۔ اور تیسرا دور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ پر بیعت لینے کے بعد ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۹ء تک۔

پہلے دور یعنی ندوہ کی طالب علمی کے زمانے کی کہی ہوئی کل سات غزلوں کا مجھے اب تک علم ہو سکا ہے جن میں سے بعض نامکمل ہیں، ان غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد ۳۲ ہے۔ سات سال کی مدت میں یقیناً انھوں نے شعر و شاعری کے ماحول میں رہ کر اس قدر مختصر کلام پر قناعت نہیں کی ہوگی۔ بہت ممکن ہے کہ ان کے کلام کا ایک حصہ ضائع ہو گیا ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے کلام کا وہ حصہ جو اس زمانے کے اخباروں، گلدستوں اور ماہناموں میں شائع ہوا ہے ابھی تک محققین کی نگاہوں سے اوجھل ہو — اور کبھی بعد میں منظر عام پر لانے میں کامیابی ہو۔

ان میں بعض غزلوں کی اشاعت سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب نے بالکل ابتدائی زمانے میں گلدستوں میں دیئے گیے مصرعہ طرح پر غزلیں کہی ہیں "بہار"، بانکیپور نامی گلدستے کے اگست ۱۹۰۳ء کے شمارے میں سید صاحب کی ایک غزل ایسی ہی شائع ہوئی جس کا مصرع طرح تھا:

فصل گل آتے ہی میخوار سنک جاتے ہیں

۵۶۔ بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات: ابوظفر ندوی: معارف سلیمان نمبر (مئی ۱۹۵۵) ص ۵۲

بہار بانکیپور میں سید صاحب کی دو غزلیں نظر سے گذری ہیں جن میں انھوں نے سید تخلص فرمایا ہے۔ علامہ کے بعض رفقا کا کہنا ہے کہ پہلے وہ رمزیؔ کے تخلص سے غزل کہا کرتے تھے ؀، لیکن مجھ کو سید صاحب کی ایسی غزلیں دستیاب نہیں ہوئیں جن میں تخلص رمزی استعمال ہوا ہو۔

جیسا کہ سیّد صاحب نے تحریر کیا ہے اس زمانے میں جو رنگ و آہنگ امیر مینائی کا لکھنؤ کی شعری فضا میں رچا بسا تھا طالب علم سیّد سلیمان کا کلام اسی کا ترجمان بن گیا تھا، وہی حسن و عشق کی داستانیں، حسن کے جور و ستم غمزے، کج ادائیاں، عشق کی مظلومیت، اضطراب مجبوریاں، زخم و مرہم کے تذکرے، نمک پاشیوں کی شکایتیں، شعلہ غم، آہ و نالے، داد خواہی کی باتیں، قطرۂ خون جگر کا اشک بن کر ٹپکنا، کفر و اسلام کے جھگڑے، عشق کا انجام، مزار عاشق، دست نازک، گلچیں، بلبل، بجلی، آشیانہ، غنچہ و لب وغیرہ کے ذکر سے ان کی شاعری بھری پڑی ہے لیکن اپنے اندر پاکیزگی، ندرت، شائستگی، اور زبان و بیان کی پختگی لیے ہوئے ہے۔ پڑھتے جائیے کہیں نہ بدمزگی پیدا ہوتی ہے نہ بے کیفی سے دو چار ہونا پڑتا ہے نہ اس کا احساس ہوتا ہے کہ کسی مبتدی کا کلام مطالعہ میں ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

ایسی توبہ سے تو بہتر ہے نہ توبہ کرنا	اور توبہ سے یہ میخوار بہک جاتے ہیں
دل ہمارا غم کا عادی ہو گیا	بیقراری جب سے ہے آرام ہے
بعد مدت کے اُسے آج ملا ہے آرام	سونے دو، چھیڑو نہیں، سوتی ہے میّت میری
بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے	ابتک ہمارے دل کو وہ تڑپائے جاتے ہیں
ادھر گلچیں خفا ہے اُدھر بیتاب ہے بجلی	خدا حافظ ہے اے بلبل ترے اب آشیانے کا
ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں	پتہ جو مل نہ سکا، تیری جستجو میں ہے
ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں	وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

اس آخری شعر کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے ایک مکتوب بنام سید سلیمان ندوی مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

؀ ارمغان سلیمان: ناشر سید محی الدین احمد کراچی ص ۱۲

آپ کی غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں — وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

اور تاریخی نظمیں لکھنے کا مشورہ ان الفاظ میں دیا تھا:

"مولانا شبلی مرحوم مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں وہ نہایت مقبول ہوئیں، غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھیے"[۲۶]

سید صاحب کی طالب علمی کی زندگی ختم ہونے کے بعد ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء کے زمانہ کو میں نے دوسرا دور قرار دیا ہے۔ اس دور کی پہلی غزل وہ ہے جو انھوں نے "بجواب محمد علی جوہر" کہی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ مولانا محمد علی جوہر نے جیل سے ایک غزل مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھ کر بھیجی تھی جس کا پہلا شعر یہ تھا:

ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا — ہو صدق طلب پھر اثرِ آہ رسا دیکھ

مولانا عبدالماجد نے اس غزل سے متاثر ہو کر ایک غزل کہہ دی تو سیّد صاحب نے بھی جون ۱۹۱۷ء میں ایک غزل حسب ذیل مطلع کے ساتھ کہی:

تشہیر کا باعث نہ ہو دامان قبا دیکھ — لائے نہ کہیں رنگ یہ خون شہدا دیکھ

اس غزل کے پردے میں سید صاحب نے مولانا محمد علی جوہر سے کچھ ایسی باتیں کہنے کی کوشش کی ہے جو کسی اور طرح سے کہنا مناسب نہ ہوتا:

تاثیر دفا، دعوئے باطل ہے سراسر — اب شوخ ستمگار پہ کچھ کر کے جفا دیکھ

بیکار ہے دشواری منزل کی شکایت — بے راہ روی خضر راہ نما دیکھ

صبر اور توکل نہیں عشاق کا شیوہ — جو بن سکے تجھ سے نہ تو رکھ اس کو اٹھا دیکھ

مقبول ہوا ہے یوسف زنداں کا تحفہ — لایا ہے جو پیغامبر شہر سبا دیکھ

اس دور کی غزلوں کی تاریخوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے دور کی آخری غزل (۱۹۰۷ء) کے بعد انھوں نے دوسرے دور میں پہلی غزل ۱۹۱۷ء میں کہی گویا تقریباً دس سال تک انھوں نے شاعری سے اپنے کو بے تعلق رکھا۔ اس دور

---

[۲۶] اقبال نامہ حصہ اول: شیخ عطاءاللہ ص ۷۷

کی غزلیں کسی سبب ضائع ہوگئیں اور اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ کبھی تو انھوں نے ایک دن میں دو غزلیں کہی ہیں اور کبھی مہینوں اور برسوں بعد غزل کہنے کی نوبت آئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض شعر کہنے کے لیے شاعری نہیں کر رہے تھے بلکہ جب بھی طبیعت اس طرف مائل ہوتی تھی شاعری کی طرف رجوع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ چونتیس سال کی اس طویل مدت میں انھوں نے کل بیس غزلیں کہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۲۲ ہے یہ اشعار بلاشبہ پہلے دور کے اشعار کے مقابلہ میں زیادہ بہتر زیادہ پُرتاثیر اور معنی کے اعتبار سے وسیع تر ہیں۔ زبان بھی نہایت سلیس اور رواں دواں استعمال کی گئی ہے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

لکھوں کس طرح رودادِ دلِ غمگیں میں کاغذ پر — کہ خط بھی رازکا محرم بنایا جا نہیں سکتا،
خضر اس عیشِ دو روزہ کا مزہ کیا جانے — شادمانی اسے کیا ہو جو غم آگاہ نہ ہو
دل چاہتا نہیں کہ تجھے بے وفا کہوں — لیکن لگاوٹ غیر سے دیکھوں تو کیا کہوں
الٹا مجھ ہی سے ترک ملاقات کا گلا — طرزِ ستم نئی ہے تغافل شعار آج
زباں سے شرحِ تمنا تو ہو نہیں سکتی — مگر جو بات ہے دل میں وہ کاش ہو جائے
یہ جان کر بھی، حسن ہے اک نقشِ بے ثبات — وہ کون ہے، فریب جو اس سے نہ کھا گیا
اظہارِ جذبِ عشق پہ مائل تو ہو گیے — تیر اثر کے آج وہ گھائل تو ہو گئے
کتنی ہو مختصر یہ کہانی حیات کی — کھوے اگر نہ حسن کی زلف دراز عشق

اس دور کی ایک غزل کے چند اشعار مزید ملاحظہ کیجیے سادہ اور عام فہم زبان ہونے کے باوجود، دل کو چھو جاتے ہیں اور ایک عجیب دیرپا کیفیت چھوڑ جاتے ہیں:

حرفِ مطلب کہا نہیں جاتا — بے کہے بھی رہا نہیں جاتا
نگہِ لطف سے نہ دیکھ مجھے — یہ ستم سہا نہیں جاتا
بات ہے سہل اور مشکل بھی — صاف کھل کر کہا نہیں جاتا
آکہ اب جان کو قرار نہیں — دردِ فرقت سہا نہیں جاتا

سید صاحب کی غزل گوئی کا تیسرا دور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاتھ پر بیعت کے بعد ۱۹۴۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کی شاعری کو خود سید صاحب نے "رسمی اور نقلی" قرار دیا ہے لیکن اس

دور کی شاعری کو جو روحانی انقلاب کے بعد وجود میں آئی ہے انھوں نے غزل الغزلات[۵] کے نام سے یاد کیا ہے اور اسے اپنا "روحانی سفرنامہ"، کہا ہے جس کی ابتدا انھوں نے تھانہ بھون سے واپسی پر ۵ اپریل ۱۹۴۲ء کو یہ غزل کہہ کر کی تھی:

پاکر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں — ہر سود و زیان دوسرا بھول گیا ہوں

یہ دور دسمبر ۱۹۴۹ء تک پھیلا ہوا ہے جس میں کل بیالیس[۴۲] عارفانہ غزلیں ملتی ہیں جو تمام کی تمام عشق حقیقی کے جذبات اور کیفیات کی مظہر اور ترجمان ہیں:

دیکھنا ہو تو نگاہ شوق بن — اس کی ہر سو بارگاہ عام ہے
بزم میں تنہا نظر آتا ہوں میں — ایک میں ہوں اور خدا کا نام ہے
فیض ہے یہ کس ولیِ وقت کا — اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

ایک مشہور غزل کے چند شعر پیش کرتا ہوں پوری غزل ایک خاص کیفیت کی حامل ہے اور دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے:

دل حریفِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں — جو نہ بے خود ہو وہ میخوار کہاں سے لاؤں
نور ہی نور جدھر دیکھو نظر آتا ہے — تاب نظارۂ انوار کہاں سے لاؤں
اُف ری دریائے معاصی کی تلاطم خیزی — وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں
ٹوٹ ہی جاتی ہے ہر موسم گل میں توبہ — جو نہ ٹوٹے میرے غفار کہاں سے لاؤں

اپنے اس دور کی شاعری سے متعلق سیّد صاحب نے خود کہا ہے:

جو شعر بھی سپرد قلم کر رہا ہوں میں — سب واردات عشق رقم کر رہا ہوں میں

اور ایک جگہ صاف صاف اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے:

سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں — مستی مری یہ، بادۂ انگور کی نہیں

اسی دور میں سید صاحب نے اپنے چچازاد بھائی ابوداؤد کی وفات سے متاثر ہو کر ایک پُر درد غزل کہی تھی جس کی آسان اور عام فہم زبان میں اس طرح کے غمناک تاثرات ملتے ہیں:

دمِ سرد ہے آہ پُر آہ ہے — تسلسل حوادث کا جانکاہ ہے

---

۵ غزل الغزلات۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی لاہوتی نغمات کا عنوان تھا۔

بھروسہ نہیں اب بجھا تب بجھا | دم اپنا چراغ سر راہ ہے
اٹھا بستر خواب آگے کو چل | ہوئی ختم شب اب سحر گاہ ہے
یہاں پیش بینی کوئی کیا کرے، | یہاں جو مصیبت ہے ناگاہ ہے
جو تھے دل کو پیارے وہ سب چل بسے | "عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے"

اسی طرح حضرت تھانوی کی وفات پر سید صاحب کے غمناک دلی جذبات کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

دل بھر کے دیکھ لو یہ جمال جہاں فروز | پھر یہ جمال نور دکھایا نہ جائیگا
گوش جہاں بغور سنے اس کلام کو | پھر یہ کلام شوق سنایا نہ جائیگا
ے میکشو یہ درد تہہ جام بھی پیو | ترسو گے پھر یہ جام پلایا نہ جائیگا

سیّد صاحب کی چند نعتیہ غزلیں بھی اسی دور کی دین ہیں جن میں مدینہ منورہ میں حاضری کے وقت کہی گئی یہ نعت بہت پسند کی گئی تھی اور آج بھی سیّد صاحب کو نعت گویوں میں منفرد مقام دلانے کا باعث ہوئی ہے:

آدم کے لیے فخر یہ عالی نسبی ہے | مکّی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے
آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو | خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے
بجھ جائے تیرے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج | جو آگ مرے سینے میں مدت سے دبی ہے

لیکن یہ سیّد صاحب کی شاعری یہیں ختم نہیں ہو جاتی، انھوں نے محض غزل گوئی ہی پر اکتفا نہیں کیا، غزل کے ساتھ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، ان کی پہلی دستیاب نظم "قوم کی تم سے امید"، ترکیب بند کی صورت میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۴ء کے اپنچ پٹنہ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم سیّد صاحب نے ندوۃ العلماء لکھنو کے طلبہ کی انجمن میں پڑھی تھی اس کے بعد انھوں نے ۲ ترکیب بند انجمن الاصلاح دسنہ کے ۱۸ اکتوبر ۱۹۰۴ء اور جنوری ۱۹۰۶ء کے جلسوں میں سنائے تھے۔ یہ نظمیں ان کی طالب علمی کے زمانے کی ہیں جو خواجہ الطاف حسین حالی کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ جن میں قومی ملّی، اصلاح اور رہنمائی کے جذبات نمایاں ہیں۔ زبان بھی سادہ اور عام فہم استعمال کی گئی ہے، لیکن جذبات میں سچائی کی وجہہ سے یہ نظمیں اپنے اثرات چھوڑتی ہیں، لہجہ بھی نہایت پُراعتماد ہے، ابتدا ملاحظہ کیجیے:

پہلا ترکیب بند ــــــ

دوستو، تم کون ہو رکھتے ہو کچھ اپنی خبر | زندگانی کرتے ہو غفلت سے کیوں اپنی بسر
سوئے ہو منزل میں تم اور قافلہ رخصت ہوا | لو اٹھو اب رات گذری آگیا وقت سحر
جانتے ہو قوم کیا رکھتی ہے تم سے آرزو | کیوں جمی رہتی ہے تم پر قوم کی ہر دم نظر

اور دوسرا ترکیب بند اس طرح شروع ہوتا ہے:

بزم کیا خوب ہے! با شان ہے جلسہ کیا | ولولے کیسے ہیں ! ہے جوش تمنا کیسا
جمگھٹے کیسے ہیں، کیا دھوم ہے، محفل کیسی | فرطِ شادی سے ہے ان ہونٹوں کا ہنسنا کیسا
او لبِ غنچہ گلزار ذرا سچ کہنا ، | کیوں ہے اظہارِ سرور اور یہ خندہ کیا

اور تیسرے ترکیب بند کی ابتدا یہ ہے

اے بزرگو! دوستو! پھر باغ میں آئی بہار | پھر وہی ہیں چہچہے اور پھر وہی صوتِ ہزار
پھر ہوا آزاد مجنوں، توڑ کر زنجیر پا | نوک کی لیتا ہے پھر تلوؤں سے دشتِ خار دار
جھومتی ہیں ڈالیاں غنچے مسرت بخش ہیں | چھائی جاتی ہے گھٹا گلزار پر مستانہ وار

ان کے علاوہ دو اہم نظمیں "بحرِ عرب" اور "بہار" ہیں جو اسی سلسلہ کا حصّہ ہیں۔ پہلی نظم میں شاعر بحرِ عرب سے مخاطب ہو کر دریافت کرتا ہے:

غصہ سے اپنے منہ پر کیوں کف تو لا رہا ہے | کیوں تیکھے تیوروں سے ہر سمت دیکھتا ہے

پھر اسی نظم میں آگے شاعر نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے:

بیگانہ ہاتھ اس کی جانب بڑھا رہا ہے | پاکیزگی پہ اس کی اب حرف آرہا ہے

اور پھر یہ نتیجہ نکالتا ہے:

غیرت تیری یہ تجھ سے سب کچھ کرا رہی ہے | غیظ و غضب کے تیور سب کو دکھا رہی ہے

اور اپنے ہم وطنوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

کچھ تم بھی سمجھے مطلب ہندوستان والو | یعنی اگر ہو غیرت کچھ تم بھی کر دکھاؤ

سید صاحب نے ایک نظم صوبہ بہار پر بھی کہی ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن اچھی ہے اور سید صاحب کے وطن سے گہرے تعلق کا اظہار کرتی ہے ملاحظہ کیجیے:

اے بہار، اے مدفنِ ابرار و اخیارِ زمین | چپہ چپہ پر ترے ہے دفن اک گنجِ ثمین
سایۂ غارِ حرا، ہر غار تیرے کوہ کا | اولیا تیرے ظلالِ انبیا و مرسلین

اے اشوکا کا وطن، اے بودھ کا ملجائے دیں — فیض تیرا ہند سے جاری ہے تا اقصائے چیں
آبشاریں تیری کیا سرچشمۂ انوار ہیں — تیرا جنگل زاہد دل کی خانقاہ اربعین
بختیار خلجی تیرا فاتح کشور کشا — فاتح اقلیم دل تیرا شہہ مخدوم دیں

اس دوران میں سید صاحب نے سیاسی نظمیں بھی کہی تھیں جن میں "نظہر الحق"، "مسٹر محمد علی جینا" اور "قدیم وجدید طرز حکومت" ان کی سیاسی بصیرت کی گواہ ہیں اور ان کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔

سید صاحب کے مجموعہ کلام میں کچھ شخصی مرثیے بھی ملتے ہیں جو ان کے رنج وغم اور افسردگی کی کہانیاں سناتے ہیں اور اس کیفیت میں ان کی فکر کے پرواز سے بھی باخبر کرتے ہیں انھوں نے پہلا شخصی مرثیہ ۱۹۰۵ء کی اوائل میں اپنے ایک عزیز کے انتقال پر لکھا تھا جو بعد میں ۲۸ فروری ۱۹۰۵ء کے الپنچ پٹنہ میں شائع ہوا تھا جس کے ابتدائی حصے میں زندگی سے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے:

چونک بھی او مست خواب زندگی — ہے لب بام آفتاب زندگی
چشمک برق، اضطراب زندگی — لے اڑی آندھی سحاب زندگی
ایسے گرداب بلا میں اے خدا — تا بہ کے آخر، حباب زندگی
ہم کو مست جام غفلت کر دیا — کیا کیا تو نے شراب زندگی
ہم انھیں آنکھوں سے کیا کیا دیکھتے — کاش اٹھتا یہ حجاب زندگی
جلوۂ کونین ان آنکھوں میں ہے — گر نہ ہوتا یہ نقاب زندگی

. . . .

آمری پیاری اجل جھگڑا اچکے — کون اٹھائے یہ عذاب زندگی
زندگی اک رشتہ کمزور ہے — ایک دن پھر موت ہے پھر گور ہے

پوری نظم نہایت رواں دواں، سید صاحب کے دل دردمند کی تصویر اور غور وفکر کا نتیجہ ہے اور ان دو شخصی مرثیوں میں اپنی پہچان رکھتی ہے۔

دوسرا شخصی مرثیہ اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کی وفات ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء سے متاثر ہو کر "نوحہ استاد" کے عنوان سے قلمبند کیا، جسے اہل نظر نے پسند کی

نگاہ سے دیکھا اور مختلف انداز سے داد دی، لب ولہجہ نہایت پُر وقار اور سنجیدہ ہے لیکن نظم جوں جوں آگے بڑھتی ہے دل کی غمناکی چھلکنے لگتی ہے:

کیا فریب صبر کھائے غم نصیب دلفگار — جس کی دولت لٹ گئی کب اسکو دل پر اختیار
جانتا ہوں ہر بشر کو رہرو عاجل سفر — جانتا ہوں زندگی کو اک لباس مستعار
جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا — پھر دل اندوہ گیں کو کس طرح آئے قرار

یہ مرثیہ طویل ہے جو رنج وغم کے مختلف موڑ سے گذرتا ہوا اور مغموم فضا پیدا کرتا ہوا اختتام کو اس طرح پہنچتا ہے:

سوگوار اپنے بزرگوں کا رہا جو عمر بھر — کون ہو اب سوگوار اس سوگوار زار کا
خون رو ئے جس نے تو دیکھی یہ تیس سال — نوحہ گر ہو کون اب اس دیدۂ خونبار کا

اور اس شعر پر مرثیہ کا اختتام ہوتا ہے:

عالم اسلام میں تھا اک وہی روشن دماغ — آہ اس تاریک خانہ کا وہی تھا اک چراغ

بلا شبہ اردو کے شخصی مرثیوں میں حالی کے مرثیہ غالب کے بعد اس مرثیہ کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے سیّد صاحب کا آخری شخصی مرثیہ "مرگ یار" ہے جو انھوں نے اپنی پہلی رفیقۂ حیات کی وفات پر اپریل ۱۹۱۰ء میں قلمبند کیا تھا اثر و تاثیر اور زبان و بیان کے لحاظ سے اردو کے شخصی مرثیوں میں اسے بھی نمایاں جگہ حاصل ہے۔ اس کے خاص طور سے یہ اشعار ایک خاص کیفیت کا اظہار کرتے ہیں:

ہم سفر وادی ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا — شمع اس راہ میں اس کا رخ انور نہ ہوا

تیرے جانے پہ گماں تھا کہ ہو محشر برپا — تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا

دل میں بیٹھا ہو کوئی اس سے تسلی تو نہیں — پردہ دل میں جو ہے بر سر منظر نہ ہوا

اس مرثیہ کو پڑھ کر حضرت اکبر الہ آبادی نے سیّد صاحب کو ایک خط میں تحریر کیا تھا:

"آپ کے اشعار نے میرے داغ دل ہرے کر دیئے۔ ہرے تو رہتے ہی تھے لہو لہان کر دیئے۔ جوش غم نے آپ سے ایسے مصرعے کہلا دیئے:

ع شمع اس راہ میں اس کا رخ انور نہ ہوا

ع وہ گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا

ورنہ صرف علمی قابلیت اور قوت قافیہ پیمائی کافی نہیں ،،

سید صاحب کے یہاں تاریخی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ شاید علاّمہ اقبال کی خواہش کا نتیجہ ہیں ''درس مساوات'' اور ''تربدا'' ، اُن کی ایسی ہی نظمیں ہیں جو علاّمہ شبلی کی یاد تازہ کرتے ہیں، ۱۸۵۷ء کے بعد اصلاحی نظموں کا اس لیے رواج ہوا تھا کہ مسلمانوں کے معاشی اور معاشرتی حالات بگڑتے چلے جارہے تھے چنانچہ حالی، شبلی اور ان کے ہم عصر اور بعد کے آنے والے شعراء نے خاص طور سے اس طرف توجہ کی اور اپنی نظموں کی مدد سے اصلاح کا کام شروع کیا چنانچہ سیّد صاحب نے بھی اپنے زمانے کے تقاضے کو محسوس کرتے ہوئے ''سرالحیات'' اور ''متاع حق گوئی کی بازارِ جہاں میں ارزانی'' جیسی اصلاحی نظمیں کہیں اسی سلسلہ کی ایک نظم جوش ملیح آبادی کی ایک ملحدانہ نظم کے جواب میں ''چراغ مصطفوی'' کے عنوان سے سیّد صاحب نے بھوپال میں کہی تھی جس کو اس زمانہ میں بڑی مقبولیت ہوئی تھی۔

ان نظموں کے علاوہ انھوں نے قطعات اور رباعیات کی طرف بھی توجہ کی تھی ان کی یہ رباعی جو انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کے پاؤں کے حادثے سے متاثر ہو کر کہی تھی بہت مشہور ہوئی تھی:

تنقید مراثی کے صلہ میں استاد دربار حسینی نے سعادت بخشی
پر سر سے ابھی کام تھا لینا باقی اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی

اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کے نکاح کے موقع پر سید صاحب نے ذیل کا قطعہ پیش کیا تھا جسے پڑھ کر سید صاحب کے مزاج کی ایک خاص کیفیت کی طرف اشارہ ملتا ہے:

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد نوشہ بنیں گے آج عبدالماجد
اللہ وہ دن بھی جلد آجائے بن جائیں وہ کسی کے والد

سید صاحب کی شاعری سے متعلق اس قدر لکھنے کے بعد جب اسے ختم کرنے

جا رہا ہوں تو یہ خیال بار بار مجھے پریشان کر رہا ہے کہ سید صاحب کی ایسی شاعری جس کی اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی اور مولانا شروانی نے تعریفیں کی تھیں، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے کیوں مخالفت کی اور کیوں لکھا "معاف کیجیے گا آپ شاعر نہیں" ـــــ غور کرتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ نواب صاحب سید صاحب کے لافانی نثری کارناموں سے بہت متاثر تھے، جب انھوں نے ان کی شاعری کو نثر کے اس بلند معیار پر نہیں پایا تو ان کی شاعری سے متعلق اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا تاکہ وہ نثری میدان ہی میں آگے بڑھتے رہیں اور کارہائے نمایاں انجام دیتے رہیں اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ سید صاحب نے شعر و شاعری کا سلسلہ ختم تو نہیں کیا لیکن بہت کم کر دیا اور نثر کی طرف پورے زور و شور کے ساتھ رجوع ہو گئے تھے۔

پرویز شاہدی کی غزل گوئی

سید محمد اکرام حسین پرویز شاہدی کی پٹنہ سٹی کے جس گھرانے میں ۳۰ ستمبر ۱۹۱۰ء کو پیدائش ہوئی وہاں شعر و شاعری کا چرچا اس طرح تھا کہ اُن کے والد محترم سید احمد حسین خود شاعر تھے اور ان کے گھر پر شعری نشستیں جما کرتی تھیں آٹھ برس کی عمر سے ان محفلوں میں اٹھتے بیٹھتے اور شعراء کے منہ سے کلام سنتے سنتے اور آہ و واہ کے مزے لیتے لیتے سید محمد اکرام خود شاعری کی قلمرو میں داخل ہو گئے اور غزل خوانی شروع کر دی، طبیعت موزوں پائی تھی اس لیے شاعری کے مختلف مدارج کو طے کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی، ابتدا ہی میں بقول پرویز شاہدی:

"..... کبھی کبھی کتر بیونت اور کاٹ چھانٹ سے کام لے کر اندوختہ، دیگراں کو بھی اپنے تصرف میں لانے کی کوشش کرتا"۔ [1]

پھر مولانا عین الہدیٰ ثم جانشیں صفیرؔ بلگرامی سے اصلاح لینے لگے، لیکن ان اصلاح شدہ غزلوں کو وہ "عطیہ استاد" سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ خود ان کے اشعار اُن میں بہت کم ہوا کرتے تھے۔ اصلاح کا سلسلہ بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکا۔ اس کے ساتھ جلد ہی، اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کی طرف رجوع ہوئے پھر بقول خود ان کے:

"دوستوں کو مرعوب کرنے کی دلی خواہش نے ناسخؔ کے پرشکوہ رنگ سخن کی تقلید کرنے کا موقع دیا"۔ [2]

---

[1] تثلیث حیات: پرویز شاہدی ص ۱۴

[2] تثلیث حیات: پرویز شاہدی ص ۱۵

چنانچہ ایک عرصے اپنے آپ کو ناسخ کے "پُر شکوہ رنگِ سخن" میں رنگتے رہے۔ پھر جب ۱۹۲۸ء میں بی اے کلاس میں پہنچے اور اس زمانے کی سیاسی اور ادبی تحریکوں سے دلچسپی شروع کی تو بہت سی حقیقتیں روشن ہوئیں، لکھتے ہیں:

"اس زمانے کی سیاسی اور ادبی تحریکوں میں حصہ لینے لگا تو اپنے معاشرہ کے کھوکھلے پن اس کے تضادات، اس کے مکر و فریب وغیرہ پر نظر پڑنے لگی۔" [۳]

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "بلند آہنگ رہنمایان فکر و عمل کے نقوش قدم کو منزل نما"، [۴] سمجھنے لگے۔ اس زمانے میں "ہندوستان میں اور بیرون ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے ہر سوچنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل متاثر ہو رہا تھا،" [۵] پرویز شاہدی نے بھی اثر قبول کیا اور ان کی شاعری نے بھی رنگ [۶] یہی نہیں بلکہ "متاعِ فقیر" میں آگے انھوں نے صاف صاف تحریر کیا ہے جس سے اُن کو، اُن کے مزاج کو اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے:

"مجھے فطرت کی طرف سے اور کوئی نعمت فکر و احساس ملی ہو یا نہ ملی ہو ایک ایسا دل ضرور ملا ہے جو کبھی آسودہ نہیں ہوتا، ایک فکر اور جذبہ باقی، نا آسودگی مجھے ہمیشہ اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔ میری یہ نا آسودگی صرف میرے زمانہ شباب ہی تک محدود نہیں رہی، آج بھی جب میری عمر آغاز پیری کی منزل میں داخل ہو رہی ہے مجھے بے قرار کیے رہتی ہے تازہ سے تازہ تر، کی تمنا دل میں لیے پھرتا ہوں، خیالات اور اسالیب بیان میں ترمیم اور تغیر سے کام لینے کی کوشش کرتا رہتا ہوں، میری دستگیری کرنے والوں میں کلاسکی ادب کے ارباب فن ہی نہیں بلکہ وہ تازہ فکر اور شگفتہ احساس لکھنے والے بھی ہیں، جن کو نئی نسل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اُن سے بھی سیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔" [۷]

---

[۳] تثلیثِ حیات: پرویز شاہدی: ص ۱۵ [۴] تثلیث حیات: پرویز شاہدی ص ۱۵ [۵] تثلیث حیات پرویز شاہدی ص ۱۵
[۶] تثلیث حیات: پرویز شاہدی ص ۱۵ [۷] تثلیث حیات: پرویز شاہدی ص ۱۷

پرویز شاہدی نے ایک جگہ یہ بھی تحریر کیا ہے :

"آٹھ برس کے سن سے شعر کہہ رہا ہوں ....

"ناسخ، آتش، میر، سودا، داغ، اور غالب کے دیوان کا مطالعہ میں ۱۹۲۶ء میں کر چکا تھا، میرے ابتدائی کلام میں ناسخ کا رنگ کافی حد تک نمایاں ہے، بی اے میں پہنچنے کے بعد غالب سے بے حد متاثر ہوا، علم اور مشق کا سرمایہ اتنا کافی نہ تھا کہ غالب کی تقلید میں کامیاب ہو سکتا، لیکن چونکہ طبیعت ابتدا ہی سے باغیانہ تھی میں نے اس وقت کے شعری اور ادبی مسلّمات سے علاحدہ ہو کر شعر کہنے کی کوشش کی۔ ۳۳ء تک میری شاعری زیادہ تر ہیئت پرستانہ رہی۔ ۳۴ء میں میری شاعری میں مواد کے لحاظ سے بھی انقلاب آیا، ہر چند یہ انقلاب صحتمند نہ تھا پھر بھی پرانے نظریات اور معتقدات کے اصنام مرمریں کے توڑنے میں بہت مفید ثابت ہوا"۔ ۵

ان اقتباسات سے پرویز کی زندگی کے جن اہم موڑوں یا اہم باتوں کا ہمیں علم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آٹھ برس کی عمر سے شاعری شروع کی، سولہ برس کی عمر تک انھوں نے ناسخ، آتش، میر، سودا، داغ اور غالب کے کلام کا مطالعہ کر لیا تھا جس سے اُن کی شاعری سے گہرے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر بی اے میں پہنچتے پہنچتے یعنی بیس سال کی عمر میں غالب سے متاثر ہوئے لیکن علم اور مشق کے سرمایہ میں کمی کی وجہ سے وہ غالب کی تقلید نہ کر سکے۔ اس بات کے اظہار کے ساتھ ہی ایک سچے حقیقت پسند اور بے باک پرویز شاہدی سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے سیاسی حالات سے متاثر ہوئے اور عملی سیاست میں اس قدر حصہ لیا کہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔

جب ہم ان کے ادبی سرمایہ یعنی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی میں صرف دو شعری مجموعے "رقص حیات" اور "تثلیث حیات" چھوڑے، جن میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔

---

۵ غیر مطبوعہ تحریر، بنام نظہر امام: ناقدروں کے مقتول پرویز شاہدی نمبر ماہنامہ مریخ، پٹنہ ص ۵۹

پرویز نے شاعری غزل گوئی کے ماحول میں شروع کی تھی اور اول اول غزل ہی سے رشتہ قائم کیا تھا اور غزل گو شعراء کے کلام کے مطالعہ ہی سے اپنی غزل کو سوز و گداز، رنگ و آہنگ اور کیف مستی عطا کی تھی، نظم گوئی کی ابتدا بعد میں ہوئی، لیکن یہ سلسلہ بھی اچھا تھا، باوقار تھا، فکر و شعور سے مالامال تھا، جذبات و احساسات سے بھرپور تھا، صدائے وقت کا علم بردار تھا، اور زبان و بیان میں پاکی صفائی، روانی اور جوش دونوں کی تصویر تھا، اس لیے قاری اور سامع دونوں متاثر ہوئے اور پرویز شاہدی کے اسیر بنے، اسی لیے پرویز شاہدی بہت جلد عوام اور خواص دونوں میں نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ ان کے چاہنے والوں کی تعداد دور دور پھیلنے لگی چنانچہ آج جہاں کلکتہ کا یا ترقی پسند شاعری کا ذکر آتا ہے پرویز سرفہرست شاعروں میں نظر آتے ہیں، اُن کی نظمیں اپنے وقت کی آواز ہیں۔ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کا عکس ہیں، باشعور ہندوستانیوں کے دل و دماغ کا پرتو ہیں، ان میں ان کے دلوں کی تڑپ، ان کے جذبات کا اضطراب، ان کے افکار کی کشمکش کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، لیکن اگر کوئی انھیں نذرالاسلام، جوش ملیح آبادی، اسرارالحق مجاز اور فیض احمد فیض کے دوش بدوش کھڑا کرے یا ان کا امام بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرے تو یہ پرویزی نہیں ہوگی، پرویز شکنی ہوگی۔ اس طرح کی تنقید یا توصیف کسی شاعر یا ادیب کے لیے صحت مند نہیں ہوتی، ہر شاعر کا اپنا مزاج، اپنا اسلوب اور کہنے کو اس کی اپنی باتیں ہوتی ہیں، پرویز کی بھی اپنی آواز ہے اپنی فکر ہے اپنا آہنگ ہے جو اس کی پہچان ہے، اس آواز کے ساتھ وہ جو کچھ پیغام دینا چاہتے تھے دیتے رہے، اُن کی آواز ساری دنیا تک نہیں پہنچ سکتی تھی نہیں پہنچی، ایک دنیا سن سکتی تھی سن سکی۔ وہ اس حد تک یقیناً کامیاب ہوئے کہ انھیں شیدائیوں کا ایک شہر آباد کرنے میں کامیابی ہوئی جو ان کو آج بھی چاہتے ہیں اور ان کا ادب ان سے متاثر نظر آتا ہے۔

نظم کے ساتھ جہاں تک ان کی غزلوں کا تعلق ہے اسے مقدار کے لحاظ سے نظموں کے مقابلہ میں اس لیے زیادہ ہونا چاہیے تھا، کہ اُن کی شاعری کی ابتدا آٹھ سال کی عمر سے ہوئی تھی اور عمر کے آخری زمانے تک وہ غزل گوئی کرتے رہے تھے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ان کی جتنی غزلیں شائع ہوئی ہیں اُن سے بہت زیادہ کہی ہوں، لیکن چونکہ ابتدا ناسخ کے رنگ سے ہوئی تھی اور بعد میں اس رنگ کو بے رنگ

سمجھ کر اس سے بے تعلق سے ہو گئے تھے طباعت کے وقت ممکن ہے نگاہ انتخاب نے بے قیمت سمجھ کر علاحدہ کر دیا ہو مگر وہ رنگ چوکھا تھا کہ یکسر اس سے علاحدہ نہ ہو سکے اور باوجود کلام غالب کو پسند کرنے اور مطالعہ کرنے کے اس سے فیضیاب اتنے نہ ہو سکے جتنا کہ پسند کا تقاضہ تھا ناسخ کے ساتھ غالب کے علاوہ آتش میر، سودا اور داغ کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا تھا، لیکن ان کا رنگ بھی ناسخ کے مقابلہ میں ہلکا رہا، اس کے باوجود جس قسم کی غزل پیش کرنے میں وہ کامیاب ہوئے اس کی اپنی قدر و قیمت ہے اس کی اپنی اہمیت ہے اور اس کی اپنی شناخت ہے جسے پرویزیت کہہ سکتے ہیں، پرویزیت سے میری مراد، وہ رنگ و مزاج ہے جو پرویز شاہدی کا اپنا ہے اور جو غزل کے رنگ پر غالب آگیا ہے۔ پرویز کی غزلوں کا مطالعہ اگر آپ حسن و عشق کے جذبات کو تسکین پہنچانے کے لیے کریںگے تو مایوسی ہوگی۔ بہت کم غزلیں آپ کو ایسی ملیں گی جن میں محبوب کے خد و خال، لب و رخسار، حسن و جمال، ناز و انداز کا ذکر ہوگا یا عشق کی بے چینی، اضطراب، بے بسی اور بے کسی کی تصویر کشی کی گئی ہوگی، یا جام و مینا کی کھنک سنائی دیتی ہوگی یا کیف و مستی کا عالم دکھایا گیا ہوگا، سوائے ان غزلوں کے جو جگر کی یاد دلاتی ہیں:

وہ کائنات عشق پہ چھاتے چلے گئے — مجھ کو بھی جز و حسن بناتے چلے گئے
کیا آگ جگر میں جل رہی ہے — ہر سانس سے لو نکل رہی ہے

یا کچھ اور غزلوں میں جہاں اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں:

ہوس والے وفا کی داستاں بننے نہیں دیتے — نگاہِ ناز کو دل کی زباں بننے نہیں دیتے
کل کا کچھ اعتبار نہیں جلد آئیے — اب تاب انتظار نہیں جلد آئیے

تیری پلکیں خلش جذبہ تخلیق نہیں — تیری آنکھوں سے توانائی افکار ملی
چشم بے خواب کو آنکھوں سے تری خواب ملے — دلِ بے تاب کو بیداری سرشار ملی
خم بہ خم مجھ کو محبت میں ہر احساس ملے — جو تمنا بھی ملی دل کو وہ تہ دار ملی

جب تک شریک حال کسی کی نظر نہ تھی — دل ہی سے ہم کلام تھی اس کی خبر نہ تھی
میں خود حجاب دوست سے محجوب ہو گیا — ورنہ حکایتِ غم دل مختصر نہ تھی

اب حسن لے رہا ہے جفاؤں کا جائزہ پہلے مری حدیثِ وفا معتبر نہ تھی

اٹھنے کو اُن کی بزم میں سب کی نظر اٹھی اتنا مگر کہوں گا کہ میری نظر کے بعد

"تثلیث حیات" کی غزلوں میں عشقیہ حصہ جو ہے وہ یہی کچھ ہے اس مختصر حصے پر نظر ڈالیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں نہ ہجر کی کسک ہے، نہ وصال کی رنگینی، نہ چھیڑ چھاڑ ہے نہ غمزہ و ادا، نہ تاک جھانک نہ اضطراب اور بے چینی ہے نہ سرمستی و بدمستی، بلکہ حسن و عشق کے جذبات کا نہایت پاکیزہ اظہار ہے اور بس ــــ ایسا کیوں ہوا۔ کیا وہ اپنی عملی زندگی میں اتنے ہی سادہ اور سپاٹ تھے اور کبھی غم جاناں سے دوچار نہیں ہوئے۔ یا جب عمر کی اس منزل میں پہنچے جب بہکنے ہی میں لطف آتا ہے تو غم دوراں نے آ گھیرا ــ حساس دل رکھتے تھے، چنانچہ جب "معاشرہ کے کھوکھلے پن، اس کے تضادات، اس کے مکر و فریب پر نظر پڑنے لگی"، تو مضطرب ہو گئے اور قدو گیسو کی فکر چھوڑ کر وطن، وطن کے لوگ، آدمیت، انسانیت، غلامی، آزادی، سچائی انصاف، ظالم و مظلوم کی فکر میں کھو کر نہایت بلند حوصلے کے ساتھ، قید و بند کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوئے اور زنداں و دشت پیمائی کی آزمایش سے بھی گذرے اور ان کی اسی زندگی کا پرتو ان کی شاعری پر پڑا، چنانچہ ان کی غزلیں حسن و عشق کی داستان طویل بننے کے بجائے ان کے افکار و خیالات، ان کے درد و غم ان کے احساس و جذبات ان کے اعمال و تجربات، ان کے نتائج افکار و اندیشہ ہائے دور دراز سے مزیّن ہو گئیں۔ اس لیے اُن کی غزلوں میں، دھڑکتے دل، تڑپتے جذبات، رعنائی حسن، دوشیزگی جمال، معطر زلفیں، سرمگیں آنکھیں، لب ہائے لعلیں، دمکتے رخسار کے بجائے، ٹھوس حقائق معتبر تجربات، اور دور رس نتائج کے ذکر ملتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں پہلے کبھی غزل کی دنیا کا سرمایہ نہیں تھیں اور پرویز شاہدی نے پہل کی، بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اُن سے پہلے بھی شعرا نے مختلف طریقوں سے ان موضوعات کو اپنی غزلوں میں جگہ دی تھی لیکن فرق مقدار و معیار و تناسب کا ہے، پرویز کی غزلوں کا اصل سرمایہ یہی ٹھہرا اور پہچان بھی یہی ہے۔ ان کی غزلوں کے اس سرمایہ کا جائزہ لیجیے تو اُن کی شاعری دل سے زیادہ دماغ کی نظر آتی ہے۔ لیکن چونکہ غزل کے مزاج کو مجروح

کیے بغیر اپنی فکر انگیز بات کہنا چاہتے ہیں اس لیے ان کے اشعار دل کو چھوتے ہیں اور دماغ کو بھی متاثر کرتے ہیں ــــ دیکھیے دنیا اور اس کے لوگوں نے کن کن تجربوں سے پرویز شاہدی کو دوچار کیا ہے وہ ایک جگہ نہایت اعتماد کے ساتھ ایک سچائی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :

یہ ہے شہرِ ہوس پہچاننا مشکل ہے لوگوں کا یہاں چہرے بھی بکتے ہیں دکانوں میں نقابوں کی

اور ملک کے حالات بیان کرتے ہوئے اس کی محفلوں میں سرگرمی کی بجائے ٹھنڈک، جوش و ولولہ کے بجائے بجھی بجھی سی کیفیت پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :

نہیں ہے محفل میں کوئی گرمی ہوئے ہیں دل سرد طربوں کے دھواں نکلتا ہے انگلیوں سے رباب بھی بجھ کے رہ گئے ہیں

بستی بستی ناچ رہی ہے کیسی بھیانک ویرانی اپنے ویرانوں کو لے کر ساتھ بیاباں بھاگ نہ جائے

بھاگتا رہا ہے صحن چمن ، دوڑتے آرہے ہیں ویرانے

نہ بوئے یاسمیں اچھی نہ رنگ نسترن اچھا کہاں کا موسم گل جب نہیں حال چمن اچھا

اور اہلِ عقل کی بے راہ رویوں پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں :

پیچ کھاتے لوٹ کر شادابیاں بھی اہلِ عقل وہ تو کہیے ہم سے دیوانے ابھی صحرا میں ہیں

ایک جگہ رہبروں کی رہبری کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اپنی طرزِ رہبری کا جائزہ لیتے نہیں کارواں کی بے دلی کو ضعف پا کہتے ہیں آپ

درسگاہوں کے برے حالات نہایت دردمندی کے ساتھ بتاتے ہیں حالانکہ غزل میں یہ خیالات عام طور سے نہیں ملتے :

نہ جانے درسگاہوں کو کہاں پہنچا کے دم لے گی یہ تعلیمی کج اندیشی، یہ بے سمتی کتابوں کی

اس سلسلہ کا ایک اور شعر نہایت اہم ہے :

فسردہ ہے علم حرف ہائے کتاب بھی بجھ کے رہ گئے ہیں
ہے راکھ ہی راکھ مدرسوں میں نصاب بھی بجھ کے رہ گئے ہیں

اس طرح کے اشعار کی قیمت کچھ انھیں لوگوں سے پوچھیے جن کا کسی نہ کسی طرح درس گاہوں سے تعلق ہے اور جو دردمند دل بھی رکھتے ہیں اور دردمند قوم بھی ہیں۔ پرویز شاہدی کا تعلق چونکہ ہمیشہ تعلیم گاہوں سے رہا اور خود وہ شاعر بھی تھے اور ہمدردِ قوم بھی تھے اس لیے اس طرح کے خیالات کا اظہار کر سکے ۔

دنیا میں تو سب رہتے ہیں لیکن اس کے داؤ پیچ سے آگاہ ہو جانا اور اس کا برملا اظہار کر دینا سب کے بس کی بات نہیں، لیکن پرویز شاہدی نے اسے بس میں کر لیا تھا۔ پرویز شاہدی کے بعض تجربے ان کی غزلوں میں اس طرح ظاہر ہوئے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

دور کی گونجتی آواز ڈرا سے ڈر دیتے	ہو نہ یہ بھی کسی رہزن کے گلے کی آواز
بکھرا بکھرا جوش جنوں ہے کون ہے کس کا دیوانہ	اپنا اپنا سب کو سودا، اپنا اپنا ویرانہ
اپنے اپنے بت ہیں سب کے اپنا اپنا بت خانہ	بت شکنی کے پردے میں بھی بت سازی ہوتی ہے

ایک غزل میں جو تقریباً پوری سیاسی ہے ملک کے حالات سے متعلق اپنے نتائج فکر کا اظہار کرتے ہیں:

یہ گلچیں گلستاں کو گلستاں بننے نہیں دیتے	جوانانِ چمن کو باغباں بننے نہیں دیتے
زمیں کو سر اٹھا کر آسماں بننے نہیں دیتے	ہوس کے سانپ ابھی لپٹے ہوئے ہیں جسم گیتی سے
ہمیں خود اپنے گھر کا پاسباں بننے نہیں دیتے	فریب پاسبانی دے کے ظالم لوٹے لیتے ہیں

یا

پہن کے آئی ہے گل فروشی، چمن میں پوشاک باغبانی	ہو کاش ہر پھول کو میسر نظر شناسی مزاج دانی

لیکن پرویز شاہدی کو یقین ہے کہ ہندوستانیوں کی سیاسی زندگی کا یہ سفر ختم ہوگا یا زندگی کی راہوں میں جن مشکلات سے وہ دوچار ہیں وہ حالات ایک دن نہیں رہینگے:

خم بہ خم ہی سہی رہ گذر ہی تو ہے	ختم ہو کر رہے گا سفر ہی تو ہے

وہ باعمل زندگی کے شیدائی تھے اور اس پر یقین رکھتے تھے کہ عمل ہی اصل زندگی کی ضمانت ہے اسی لیے انھوں نے اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے:

زندگی انگڑائیوں کا نام ہے	جاگتی رعنائیوں کا نام ہے
شوق بزم آرائیوں کا نام ہے	رونقِ خلوت بڑھائے بے دلی

زندگی کو فطرت نے خم بہ خم بنایا ہے	زلف کی طرح اس کو بھی سنوارتے رہیے
ورنہ دیوار بھی، مثلِ در ہی تو ہے	سر پٹکنا اسیروں کو آتا نہیں
جگا لے حوصلے کو اے دل شوریدہ سر پہلے	غلط ہے ڈھونڈھنا زنداں کی دیواروں میں در پہلے

اور ایک غزل میں عمل کی ترغیب اس طرح دیتے ہیں:

ہے تیز ہوا، ہلتا ہے قفس، خطرے میں پڑی ہے سر تیلی
فریادِ اسیری بند کرو، اب جنبش لب کی بات کرو،

یا

کیوں دار ورسن کے سائے میں منصور کی باتیں کرتے ہو
رکھتا ہے جو اونچا سر اپنا، تو اپنے ہی سر کی بات کرو

یا

کیوں اہل جنوں ارباب خرد کی محفل میں خاموش رہیں
وہ اپنے ہنر کی بات کریں تم اپنے ہنر کی بات کرو

عمل کے ساتھ انھیں اس بات کا یقین ہے کہ:

میری ناکامیاں تہہ بہ تہہ ہیں، آخری تہہ میں فتحیں ملیں گی
حاصل سعی پیہم یہی ہے لذت سعی پیہم تو دیکھو
نیند تقدیر کی اڑ گئی ہے کھول دی ہیں امنگوں نے آنکھیں
زندگی آج لہرا رہی ہے میرے خوابوں کا پرچم دیکھو

ان کو اس پر بھی یقین ہے کہ شوق ہی عظمتِ آدم کا باعث ہے جس کا اظہار وہ نہایت دلنشیں انداز میں اس طرح کرتے ہیں:

اب نظر ہے تصور کے آگے، لیں زمیں کے قدم چاند تارے
آسماں نے بچھائی ہیں آنکھیں، شوق کا خیر مقدم تو دیکھو

چنانچہ عشق و فلسفہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ عشق ہی نے زندگی سرو قدی عطا کی ہے:

عشق سے ہے سرو قامت زندگی فلسفہ پرچھائیوں کا نام ہے

بعض جگہ پرویز شاہدی کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں کی سرحدیں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں، بلکہ غم دوراں سے گذرنے کا حوصلہ غم جاناں ہی کی وجہ سے پیدا ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

پہلے تو یہ کس بل غم دوراں میں نہیں تھا ظالم کو ملا ہے غم جاناں کا سہارا

یا وہ دار و رسن کے جادے ہوں یا طوق و سلاسل کی راہیں
گذرا ہوں غزل خواں تیرے لیے گذروں گا غزل خواں تیرے لیے
مانا غم دوراں کی شدت کچھ اور بھی بڑھتی جائے گی
لیکن غم جاناں تیرے لیے اس کو بھی گوارا کیوں نہ کروں

ان کے علاوہ بھی پرویز شاہدی کے بہت سے ایسے اشعار اُن کے مجموعہ ”تثلیث حیات“ میں بکھرے پڑے ہیں جو نہایت فکر انگیز ہیں اور قاری یا سامع کو نہ صرف متوجہ کرتے ہیں بلکہ ان کے قلب و نظر کو متاثر بھی کرتے ہیں:

بھانپے تو بہت آپ نے سر نوج کے تیور
بنا کر صبح کا بھیس اپنی شام غم کرے گی کیا
اے زندگی نقاب الٹ کر جواب دے
گل چینی کا ہاتھ بٹایا کلیوں کی معصومی نے
تشنگی ساغر شکن ہے قدر جام جم کہاں؟
تنظیم اہل بزم سے ہے ساری روشنی
راہ گذر رہی راہ گذر ہے راہ گذر سے آگے بھی
تھک کے سب سو گیے ہیں دیوانے
جناب شیخ ذکر خلد میں باتیں بنا تے ہیں
منزل بھی ملے گی رستے میں تم راہ گذر کی بات کرو
برق ستم کو نذر کروں بھی تو کیا کروں
کرنے چلا ہے چشم کرم کا مقابلہ

کشتی میں جو پلتا ہے وہ طوفاں نہیں دیکھا
اندھیرا روشنی بن کر اجالا ہو نہیں سکتا
فن ہم سے پوچھتا ہے کہ فن کار کیوں ہوئے
ورنہ ڈالی ڈالی جھکی تھی دینے چمن کو نذرانہ
”میں ہی میں“ کا دور ہے اب تم کہاں ہم کہاں؟
میں شمع انجمن ہوں نہ تم شمع انجمن
ہم نے جا کر دیکھ لیا ہے راہ گذر سے آگے بھی
گذر گیا ہے بڑھ کے صحرا سے
کوئی پوچھے کہ جنت کیوں یہاں بننے نہیں دیتے
آغاز سفر سے پہلے کیوں انجام سفر کی بات کرو
اب کیا رہا ہے آگ لگانے کو گھر کے بعد
صورت تو دیکھیے ستم روزگار کی

اس طرح پرویز شاہدی کے مجموعہ کلام ”تثلیث حیات“ میں سے جب ہم صرف ان کی غزلوں کا ہی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان غزلوں میں محض حسن و عشق کی دنیا کے محدود کرداروں اور ان کے جذبات اور احساسات کے علاوہ ایک ایسی وسیع دنیا بھی آباد ہے، جو ہماری دنیا کے دکھ، درد، غم و الم، ظلم و ستم مصائب و مشکلات، مسائل اور الجھنوں،

پیچیدگیوں اور پریشانیوں کو نہ صرف پیش کرتی ہے بلکہ اُن سے بنرد آزمائی کا حوصلہ اوران کا مقابلہ کرنے کی قوت اوران کے حل کر لینے کے طریقہ سے بھی آگاہ کرتی ہے، اس دنیا میں ہم جیسے انسان بستے ہیں ان کی سانسوں کی گرمی اور نرمی سے ہم لذت یاب ہوتے ہیں، اوران کے دلوں کی دھڑکنوں سے مچل اٹھتے ہیں، ان کی پریشانیاں ہمیں پریشان کردیتی ہیں اوران کے عزائم ہمیں حوصلہ مند بناتے ہیں، کہیں کہیں یا کبھی کبھی حسن وعشق کی پُرکشش پرچھائیاں بھی ملتی ہیں، کیف ومستی کی کیفیتیں بھی نمایاں ہوتی ہیں عشق کی سرشاری اور حسن کی تابناکی کا بھی نظارہ ہوتا ہے لیکن کم کم اس لیے کہ جس دور سے پرویزشاہدی کا تعلق رہا ہے وہ جنگ آزادی کے غلغلوں سے گونج رہا تھا، اور طرح طرح کے قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل سے بوجھل تھا، پرویز شاہدی نے دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح غزل کو یکقلم لائق گردن زدنی قرار نہیں دیا، نہ اس میں کیڑے نکالے، نہ اسے بے وقت کی راگنی سمجھا، بلکہ اس سے کبھی آنچل کبھی پرچم، کبھی ڈھال تو کبھی ہتھیار کا کام لیا اوراس کی مدد سے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے لیکن غزل کے مزاج اور آہنگ کو برقرار رکھنے کی بھی کوشش کرتے رہے اوراس طرح اپنی غزلوں سے اردو غزل کے سرمایہ میں اضافہ بھی کرتے رہے - یہ کہنا بجا ہے کہ یہ غزلیں پرویز شاہدی کی پہچان بھی ہیں اوران کی اہمیت کی ضمانت بھی ـــ

(دو ماہی "اردو اکادمی"، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو جولائی ۱۹۸۲)

فراقِ گورکھپوری ایک منفرد شاعر

یہ تو سب جانتے ہیں کہ فراق کا خاندان متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اس طبقہ کے بچوں کی جس طرح دیکھ ریکھ پرورش اور تعلیم وتدریس ہوتی ہے فراق کی بھی اس سے مختلف نہیں ہوئی۔ یہ بھی درست ہے کہ بہت سارے بچوں کی طرح فراق بھی ذہین تھے، سمجھدار تھے، اچھے برے کی تمیز رکھتے تھے، اچھی اور خوبصورت چیز پسند کرتے تھے، البتہ بہت سے دوسروں کے مقابلہ میں حساس بھی تھے اور جذباتی بھی، اس کے ساتھ محبت اور نفرت دونوں جذبے میں ان کے یہاں شدّت تھی، محبت بھی ٹوٹ کر کرتے تھے اور نفرت میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے، لیکن زندگی کی اچھائی خلوص اور شرافت کی قدروں سے بے حد متاثر ہوتے تھے چنانچہ اس کا اظہار فراق نے محب محترم محمد طفیل کے نام ایک خط میں اس طرح کیا ہے:

> "اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھائی، خلوص اور شرافت کی قدریں بھی مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کرتی تھیں۔ جن گیتوں، کہانیوں اور واقعات میں ان قدروں کی جھلک دکھائی دے جاتی اُن سے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے"[1]

فراقِ گورکھپوری کے یہ آنسو بڑے قیمتی تھے جنھوں نے زندگی کے بعض مراحل میں ان کو دوسروں سے ممتاز اور منفرد کیا اور بہتر زندگی کا حوصلہ دیا ورنہ ممکن تھا کہ وہ جو کچھ بن سکے وہ نہ بنتے کچھ اور بن جاتے۔ یہ بات نہایت اہم اور غور طلب ہے کہ ابھی

---

[1] صاحب: محمد طفیل ص ۱۵۳

انھوں نے زندگی کی اٹھارہ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ ازدواجی زندگی سے منسلک ہو گئے لیکن یہ شادی پیغامِ محبت نہیں لائی بلکہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ بن گئی، ان کی شریکِ حیات نہ صرف اُن کو پسند نہیں آئیں بلکہ ان کے خلاف ان کے دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہو گیے۔ جس نے اُن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا لیکن یہ نفرت ان کی زندگی کو توڑ پھوڑ نہ سکی۔ یہی فراق کی عظمت ہے کہ انھوں نے اس وقت جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا۔ ان کے اندر کی شرافت کام آئی اس نے انھیں سنبھال لیا اور ان کا احترام بہتوں کے دلوں میں پیدا کر دیا۔ انھوں نے خود اس واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

"میری شادی نے زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی، نہ پاگل ہوا اور نہ جرائم پیشہ بنا، نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا اس لیے کہ شدید حسن پرستی کے باوجود، زندگی کی شرافت کی جو قدریں مان چکا تھا۔ ان کا میں نے سہارا لیا، فرایض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا" [۲]

اور

"بیوی کو مستقل طور پر اس کے میکے بھیج دینا یہ بھی بڑا ظلم معلوم ہوتا تھا اس لیے ساتھ رہنا اور برابر غصہ اور نفرت، بے دلی اور بد دلی کے ساتھ جیتے رہنا میرے حصے میں آیا" [۳]

فراق بارہ تیرہ سال کی عمر سے شعر کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں پا رہے تھے انھیں جذبات تو مل جاتے تھے لیکن الفاظ نہیں ملتے تھے یا یوں کہیے جذبات پر قابو پا کر اُن کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے اور الفاظ کو اشعار کی نغمگی عطا کرنے کی ابھی اُن میں قدرت پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے کہ شاعری کو جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت پڑتی ہے۔ جذبات کے دریا میں ہلچل کے بجائے روانی کی اہمیت ہوتی ہے، دل کی کسک اس میں تاثیر پیدا کرتی ہے فراق کی شاعری کو اس کسک اور تڑپ، بے چینی اور اضطراب کا انتظار تھا، شاید شادی کے المیہ نے انھیں اس وقت یہ

---

[۲] صاحب: محمد طفیل ص ۵۴ [۳] آپ بیتی نمبر نقوش لاہور مرتبہ محمد طفیل ص ۱۲۶۷

سب کچھ دے دیا، چنانچہ وہ اس طرف متوجہ ہوئے، جذبات کو بھڑکنے سے روکا اور ان پر قابو پالیا تو ان کے دل میں شاعری کسمسائی اور کروٹ لینے لگی۔

وہ جس وقت شاعری کے میدان میں اتر رہے تھے انگریزی، اردو اور ہندی زبانوں سے واقف تھے، ممکن ہے کہ انگریزی زبان پر انھیں عبور حاصل نہ ہو، لیکن ہندی اور اردو دونوں ان کی اپنی زبان جیسی تھیں یہ اُن کی اُردو دوستی تھی کہ انھوں نے اسی زبان کو اپنایا اور اس کو اپنی شاعری اور ادبی خدمات کا ذریعہ ٹھہرایا، اس لیے کہ بچپن سے اُن کا گہرا لگاؤ اسی زبان سے تھا۔ انھوں نے اسی زبان میں لوریاں سنی تھیں، اِسی زبان کی کہانیوں نے انھیں کبھی خوش کیا تھا اور کبھی حیرت زدہ بنا دیا تھا کبھی اداس کر دیا تھا اور کبھی ان سے زندگی کا حوصلہ ملا تھا اور حیات وکائنات کا عرفان حاصل ہوا تھا، اردو سے اس گہری وابستگی کا اظہار انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:

میری گھٹی میں پڑی تھی ہو کے حل اردو زباں
جو بھی میں کہتا گیا حسنِ بیاں بنتا گیا

اردو کو انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا اور بلاشبہ یہ زبان ان کے ہر قسم کے خیالات، واردات، جذبات، احساسات اور تجربات کو من وعن پیش کرنے میں کامیاب ہوئی۔ فراق نے بھی اس زبان کو اپنے رنگارنگ خیالات، نئے نئے ہندی کے نرم و شیریں الفاظ، نادر تشبیہات، استعارات اور ہندوستانی تلمیحات سے مالامال کرنے کی کوشش کی اور وہ کامیاب ہوئے۔ ان کی اس کوشش کو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ چاہتے بھی تھے کہ اس زبان کے لیے بہت کچھ کریں، چنانچہ انھوں نے نہایت واضح الفاظ میں کہا تھا:

میں نے اردو کو نئے الفاظ، نئی تشبیہات اور نئے استعارے دیئے ہیں، لیکن میرا دل اتنا کچھ کرنے اور کہنے پر مطمئن نہیں ہوا، چاہتا ہوں کہ اردو کے لیے وہ کچھ کر جاؤں جو ابتک کسی نے نہ کیا ہو، شعر میری زندگی ہے اور اُردو اس کا ذریعہ، اس طرح اُردو میری زندگی ٹھہری اور اپنی زندگی سے کسے نجبت نہیں ہوتی۔[۵]

---

[۵] آپ بیتی نمبر، نقوش لاہور مرتب محمد طفیل ص ۱۳۶۶

انھوں نے نظمیں بھی کہیں، غزلیں اور رباعیاں بھی، عام طور سے ان کی نظموں میں فکر و فلسفہ کے ساتھ حسن و جمال کا اثر نمایاں نظر آتا ہے، بعض نظمیں منظر کشی میں کامیاب ہیں اس کے ساتھ انھوں نے غیر مقفیٰ نظمیں بھی کہی ہیں، منظوم ترجمے بھی کیے ہیں، "تلاش حیات"، داستانِ آدم، "دھرتی کی کروٹ"، اور "ہنڈولہ"، وغیرہ فراق کی اچھی نظموں میں سے ہیں جو ان کی نظم گوئی کے فن کی پہچان بھی ہیں اور فراق کی فکر و خیال کی عظمت کا نشان بھی اور زبان و بیان پر قدرت کی مثال بھی۔

رباعیوں کے سلسلے میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس صنف میں جو روز بروز بے توجہی کا شکار ہوتی جارہی تھی فراق کی توجہ نے بڑی جان ڈال دی اور نئی توانائی پیدا کر دی چنانچہ شعرا، ایک بار پھر اس کے اسیر ہونے لگے، لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ فراق کی غزل گوئی کی بات کچھ اور ہے انھوں نے اس صنف کو بہت وقت دیا اور اسے خوب سے خوب تر بنانے اور اس کی عظمتوں کو چار چاند لگانے کی بھرپور کوشش کی اور وہ کامیاب ہوئے، انھوں نے اچھے فکر انگیز، حیات بخش، کیف و مستی سے سرشار اشعار سے اپنی مختصر اور طویل غزلوں کو آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کرنے میں سرخروئی حاصل کی، چنانچہ ایک دنیا ان کا احترام اور ان کی شاعری پر ناز کرنے لگی اور ان کا نام اصغر، فانی، حسرت، جگر کے ساتھ لینا پسند کرنے لگی۔

اُن کی غزلوں کے اصل سرمایہ میں حسن و عشق کی باتیں، گھاتیں، سرخوشی و سرمستی، سرگوشی و سرشاری، حیرانی و سرگرانی، سرخروئی و ناکامی، غمناکی و المناکی، اضطرابی و اضطراری کیفیات نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، کہ دل بھی مضطرب ہوتا ہے، دماغ بھی متاثر ہوتا ہے ان کی شاعری میں حسن و عشق کے جادو جگانے کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا وہ ان کیفیات سے خود بھی سرشار ہوتے رہے اور اپنے چاہنے والوں کو بھی سرشار کرتے رہے۔

ذرا ملاحظہ کیجیے حسن کو الفاظ کے ذریعہ اشعار میں جب ڈھالتے ہیں تو اس سے زیادہ کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ حسن اپنی تمام عشوہ طرازیوں، نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ اس طرح ان کے اشعار میں جلوہ افروز ہوتا ہے کہ اصل سے زیادہ اصل محسوس ہونے لگتا ہے:

ہر عضو بدن جام بکف ہے دم رفتار — اک سرو چراغاں نظر آتا ہے خراماں
سانچے میں ڈھلے شعر ہیں یا عضو بدن کے — یا فکر رسا جسم سراسر غزلستاں،
ہر جنبش اعضا میں چھلک جاتے ہیں صد جام — ہر گردش دیدہ میں کئی گردش دوراں
خمیازہ پیکر میں چٹک جاتے ہیں غنچے — رنگینی قامت چمنستان بہ چمنستان

یا حسن و عشق کی باتیں جب شعر کا پیکر اختیار کرتی ہیں تو اشعار اپنی تمام سادگی کے باوجود، دل و دماغ اور جذبات و احساسات کے جن تاروں کو چھیڑتے ہیں اور جن کیفیات و احساسات سے دوچار کرتے ہیں وہ ان اشعار میں محسوس کیے جا سکتے ہیں:

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے — اک شرح حیات ہو گئی ہے
مدت سے پتہ ملا نہ دل کا — شاید کوئی بات ہو گئی ہے
اکثر شب ہجر دوست کی یاد — تنہائی کی جان ہو گئی ہے

رات بھی نیند بھی، کہانی بھی — ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی
خلق کیا کیا مجھے نہیں کہتی — کچھ سنوں میں تیری زبانی بھی
سر سے پا تک سپردگی کی ادا — ایک انداز ترکمانی بھی

کچھ اپنا غم، کچھ محبوب کی بے التفاتی کا غم، اور کچھ زمانے کا غم، سب نے فراق کو غمناک کیا، بے انتہا مضطرب کیا اور پھر رفتہ رفتہ عادی بنا دیا، پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ اس غم کے بغیر زندگی نامکمل تصور کرنے لگے:

آج بھی بہت اداس ہوں — یوں کوئی خاص غم نہیں
یہ تو نہیں کہ غم نہیں — ہاں میری آنکھ نم نہیں
موت اگرچہ موت ہے — موت سے زیست کم نہیں

اس کے ساتھ یہ اشعار بھی پڑھیے:

غم سے چھوٹ کر یہ غم ہے مجھ کو — کیوں غم سے نجات ہو گئی ہے
مٹنے لگیں زندگی کی قدریں — جب غم سے نجات ہو گئی ہے

سوز غم سے نہ ہو جو مالا مال — دل کو سچی خوشی نہیں ہوتی

وہ تو کوئی خوشی نہیں جس میں درد کی چاشنی نہیں ملتی

تجربوں اور مشاہدوں نے زندگی، انسان اور دنیا کی سچائیوں سے انھیں آگاہ کیا ہے جو غور و فکر کی منزل سے گذر کر اشعار کی صورت میں نمایاں ہو گئی ہیں اور اردو ادب کا قابل قدر سرمایہ قرار پا گئی ہیں:

ایک دنیا ہے میری نظروں میں "پر وہ دنیا ابھی نہیں ملتی"

ساغر کی کھنک، درد میں ڈوبی ہوئی آواز اس دور ترقی میں دکھی ہے بہت آواز

کیا ہونے کو ہے کار گہہ دہر میں ساقی جس سمت نظر جائے قیامت کے ہیں آثار

گراں ہے دور حاضر ایک جہاں پر بڑھیں اب انقلاباتِ سُبک گام

یا اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہو گئی ہے

انساں کو خریدتا ہے انساں دنیا بھی دکان ہو گئی ہے

اِن خیالات کے اظہار کے باوجود وہ انسان کی عظمت کے نغمہ خواں رہے:

اہل نظر ہے بے پناہ، شان جمالِ آدمی گم ہوں حواس حور کے ہوش اڑے پری کے بھی

زندگی سے متعلق ان کے یہ خیالات بھی زندگی کی حقیقتوں کی آئینہ داری کرتے ہیں اور بہتر زندگی کا طریقہ اور سلیقہ سکھاتے ہیں:

حیات بے محبت سر بسر موت محبت زندگی کا دوسرا نام

بحر حیات سے نہ ڈر اس سے نہ ڈھونڈ تو مفر تجھ کو یہی سکھائے گا راز شناوری کے بھی

اس کے ساتھ انھیں اپنے شعور اور شاعری کی سحر کاری کا اندازہ اچھی طرح تھا اسی وجہہ سے وہ یہ کہنے میں نہیں جھجکے:

یہ اُداس اُداس یہ بجھی بجھی کوئی زندگی ہے خراق مگر آج کشت سخنوری اسی کے دم سے چمن چمن

میری ہر بات آدمی کی عظمت کا نشان ہو گئی ہے

اور شاعری کیا نثر میں بھی وہ قابل احترام تھے، نثر کی وادی میں وہ کہانیاں سناتے ہوئے داخل ہوئے لیکن کہانیاں سناتے سناتے بہت جلد تھک گئے اور بیزار ہو گئے۔ ایسے بیزار ہوئے کہ پھر کہانیاں کیا سناتے اپنی کہانیوں کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا یہاں تک کہ وہ کہانیاں خود کہانی بن گئیں۔

البتہ اچھی اور بُری، خوبصورت اور بدصورت کی تمیز بچپنے ہی سے انھیں قدرت

سے ملی تھی، اسی تمیز نے تنقیدی شعور عطا کیا، اور تنقیدی شعور کو ادب کے مطالعہ نے نکھارا، جس کا اظہار انھوں نے اپنی تنقیدی تحریروں سے کیا ہے وہ اس راستہ پر دور تک چلے یا نہ چلے دیر تک ضرور چلے اور اپنے شعور کا عکس اس میدان میں چھوڑ گئے۔ ان کی نثری خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہنا بجا ہے کہ ان کے نثری کاموں کے ذخیرہ میں ان کے خطوط کی اشاعت نے اضافہ کیا ہے۔ سنا ہے کہ وہ بات کرنا خوب جانتے تھے اور اپنے پسندیدہ ملنے والوں سے خوب خوب باتیں کرتے تھے اور اچھی بُری ہر طرح کی باتیں کرتے تھے اتنی باتیں کرتے تھے کہ صبح سے شام ہو جائے اور خبر نہ ہو کبھی ایسا ہوتا کہ سامنے والے باتیں کرتے کرتے تھک جاتے لیکن فراق کی گفتگو کے اتار چڑھاؤ گرمی، نرمی کا وہی عالم رہتا تھا، انھیں کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی، لطیفے بھی سناتے تھے، طنز و تعریض کی بوچھار بھی کرتے تھے، ہنستے بھی تھے ہنساتے بھی تھے، غصہ بھی کرتے تھے غصہ دلاتے بھی تھے محظوظ بھی کرتے تھے بدحظ بھی ہوتے تھے۔ یہی انداز اُن کے خطوط میں بھی نظر آتے ہیں، انھوں نے مختصر خطوط بھی لکھے ہیں طویل بھی، وہ دلچسپ بھی ہیں بدمزہ بھی، سیدھے سپاٹ بھی ہیں روکھے پھیکے بھی، محض خط بھی ہیں تنقید کا مرقع بھی، تفسیر کی تصویر بھی، آپ بیتی بھی ہیں جگ بیتی بھی، لیکن اُردو دنیا کافی دنوں تک فراق کے ان خطوط کے مطالعہ سے محروم رہتی اگر اُردو کے ایک عاشق صادق محمد طفیل اللہ ان کا اس دنیا میں بھی بھلا کرے اور دوسری دنیا میں بھی کہ انھوں نے بہت سے خطوط نقوش کے عظیم نمبروں اور بعض عام شماروں میں شائع کیے اور جب اس طرح تسکین نہیں ہوئی تو تیس اہم خطوط کو جو فراق کی حیات اور کائنات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں "من آنم" کے نام سے نہایت صاف ستھری اور دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیئے۔

بہت خوب محمد طفیل تیری عمر دراز

لیکن یہ خطوط بھی ابھی تمام نہیں ہیں۔ ابھی سب کہاں، کچھ "من آنم" کی صورت میں نمایاں ہوئے ہیں خطوط کا بڑا حصہ ان کے پاس محفوظ ہے جو اشاعت کے لیے مچل رہے ہیں اور شائقین ان کے مطالعہ کے لیے بے چین ہیں اور اس طرح ہزارہا وہ خطوط جو اُن سے تعلق رکھنے والوں کے پاس محفوظ ہیں

اشاعت کا مطالبہ کر رہے ہیں، دیکھیے کب وہ اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔ ان خطوط کے بڑے ذخیرہ کی اشاعت کے بعد ہی فراق کی خط نگاری کی صلاحیت اور عظمت سے پوری آگاہی ہو سکے گی اور ان کی خط نگاری سے متعلق صحیح فیصلہ کیا جا سکیگا۔

اب اگر مجموعی طور سے دیکھا جائے تو فراق صاحب ایک اچھے معلّم بھی تھے، ایک قابل قدر دانشور بھی اردو ہندی اور انگریزی زبانوں کے محترم نثر نگار بھی اور اردو کے بہت اچھے شاعر بھی، اتنے اچھے کہ وہ مورخین ادب یا ناقدین فن کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کرتے رہیں گے اور جب بھی اردو کے بہت اچھے شاعروں کی صف بندی کی جائے گی تو وہ یقیناً اچھے شعراء کی صف میں نمایاں حیثیت کے مالک ہوں گے۔ لیکن اس سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش مبالغہ کہلائے گی۔ میرا خیال ہے کہ کسی شاعر کی صحیح قدر اسی وقت ہوتی ہے جب اس کے متعلق وہی رائے دی جائے جو وہ ہے یا اس کا مرتبہ جو کچھ ہے اسی کا اس کو مستحق قرار دینا ادب نوازی بھی ہے شاعر پرستی بھی۔

(فراق نمبر حصہ اول نیا دور لکھنو مارچ۔ مئی ۱۹۸۳ء)

ساحرؔ، تلخیاں، پرچھائیاں

ساحر لدھیانوی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیدھی، سادی زبان، عام فہم الفاظ کے ذریعے اپنے سچے افکار وخیالات اور جذبات واحساسات کو پیش کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہے ہیں، "تلخیاں"، کی پہلی نظم "ردعمل"، پڑھیے:

چند کلیاں نشاط کی چن کر مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

دھیمی لے، آسان زبان، مانوس الفاظ میں یہ مختصر نظم سادگی کے ساتھ محبت بھرے دل کی کہانی سناتی ہے، جس میں ناکامی کا شدید احساس ملتا ہے اور غمناک فضا اپنا اثر دکھاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تقریباً یہی تاثر ان کی تمام تر نظموں سے ہوتا ہے، لیکن کچھ فرق کے ساتھ، ان کا محبوب کبھی رنگ وروپ بدلتا ہے اور مختلف شکل وصورت اور حالت وکیفیت میں دکھائی دیتا ہے اور کبھی وہ شاعری کے پردے سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ تب۔ غیر مطمئن ماحول، معاشرت کی تلخ ترش باتیں، نرم وسخت حادثات اور پیچیدہ مسائل سر اٹھاتے اور ساحر کو جھنجھوڑنے لگتے ہیں اور مضطرب اور بے چین کر دیتے ہیں۔ اور وہ محبوب کے نرم ونازک لمس کے احساس، سیاہ زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں، رنگ ورعنائی کی فضا سے نکل کر زلف گیتی کے سنوارنے کا عزم کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کو ہندوستان کے غریب کسانوں کی خستہ حالت پریشان کرتی ہے۔ مفلس اور کنگال کی بے کسی مضطرب کرتی ہے، محنت کش مزدوروں کی مجبوری اکساتی ہے اور پھر اُن کی شاعری کی حدیں اور زیادہ وسیع ہوتی ہیں، پھیلتی ہیں اور غم دوراں کی کہانیاں سناتی ہیں۔ ایسی کہانیاں جو سننے والوں کو بھی غمناک بنا دیتی ہیں۔ معاشرے کے ان کمزور پہلوؤں کی

طرف نشان دہی کرتی ہیں۔ جہاں عورت بہن نہیں رہتی، بیٹی کا احساس نہیں دلاتی، شریک حیات کا نام نہیں پاتی اور ماں کے مقدس مرتبے سے محروم ہو جاتی ہے۔ عورت کی مظلومی، مجبوری اور بے کسی و بے بسی کی انگنت تصویریں نگاہوں کے سامنے سے گذر جاتی ہیں۔ اور ذہن میں کبھی اضطراب پیدا کرتی ہیں اور کبھی دلوں کو غموں سے بوجھل بنا جاتی ہیں۔ ان کی شاعری اسی ڈگر پر چلتی ہوئی عالمگیر مسائل کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ پھر جنگ کی باتیں ہوتی ہیں، توپوں کے دہانے گرم اور دھواں دار دکھائی دیتے ہیں، بارود کی بو پھیلتی ہے اور رنگ و نور کی دنیا کو بے رنگ کرتی، بے نور کرتی اور آبادیوں کو متاثر کرتی تباہی کے ناچ ناچتی نظر آتی ہے پھر قحط انگڑائی لیتا ہے، بھوک اور افلاس قہر آلود نگاہیں دکھاتی ہیں۔ انسانی مجبوری، بے کسی اور بے بسی، کھسیانی ہنسی ہنستی ہیں۔

ساحران حالات کو دیکھتے ہیں ان کے ردعمل کے واقعات سنتے ہیں تو احساسات بے چین کرتے ہیں، جذبات مضطرب کرتے ہیں، جنگ اور اس کے نتائج سے خود بھی خوف زدہ ہوتے ہیں اور ایک دنیا کو بھی خوف زدہ کرتے ہیں۔ نتیجے میں ان مصائب سے نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں اور امن پسندوں کی صف میں آ کھڑے ہوتے ہیں اور امن کے لیے سازگار فضا تیار کرنے والوں کے ہمنوا بن جاتے ہیں، لیکن اس وقت تک تو ساحر "تلخیاں" کے شعری تخلیقات کو زمانہ ماضی میں چھوڑتے ہوئے "پرچھائیاں" کی صبح و شام میں سنجیدہ، باشعور، باوقار، فکرمند اور باوزن دکھائی دیتے ہیں۔ مگر تلخیاں کے ساحر تو کچھ اور تھے۔ ذرا پچھلے پانچویں دہے کے ابتدائی حصے میں داخل ہوئے تو پہلے ایک طالب علم کے روپ میں نظر آئینگے جذباتی، ناتجربہ کار، حسن پرست، پیکر عشق، لیکن ناکام، نامراد کبھی مسرور کبھی مغموم کبھی جھلاہٹ کے شکار جذباتی نوجوان، الہڑ، محبوب کو محبت کا واسطہ دیکر بغاوت پر آمادہ کرتے ہوئے یہ کہتے نظر آتے ہیں:

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اس طالب علمی کے زمانے میں ناتجربہ کار ساحر کسے اس طرح کے اکھڑے جذبات اور ناپختہ خیالات ہی کی اُمید کی جاسکتی تھی لیکن اس کے بعد وہ سنبھل گئے چنانچہ اپنے اس طرح کے کھردرے جذبات اور خیالات کا پھر کبھی اظہار نہیں کیا، بلکہ اس کی شاعری

بنتی، سنورتی اور نت نئے تجربوں سے نکھرتی گئی زبان کے لحاظ سے بھی، افکار کے معیار سے بھی، اظہار کے فن سے بھی، فکر و خیالات کی پختگی سے بھی شعری آہنگ کے لحاظ سے بھی ان کی شاعری پروان چڑھتی گئی اور اپنے رنگ لے لب و لہجہ اور مسائل و مقاصد کی سمت بھی مقرر کرتی گئی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنی شاعری کا سارا سرمایہ ابتدا ہی سے بالکل انمول، غیر مستعمل اور انوکھا لائے تھے میں اس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا کہ ابتدا میں ان کی شاعری میں جذبات کس سے متاثر تھے اور وہ کہاں سے آئے تھے کون کس سے متاثر ہوا تھا، کس نے کس کا اثر قبول کیا تھا، یہ بات بحث طلب ہے لیکن لاحاصل۔ بات صرف یہ ہے کہ کالج کا طالب علمی کا زمانہ ہر نوجوان کے لیے تجربات سے زیادہ حسین خواب و خیال کا زمانہ ہوتا ہے وہ عام طور سے حقیقی دنیا کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی رنگین اور حسین دنیا میں رہتا ہے اور فریب کو حقیقت سمجھتا ہے۔ ہمارے شاعر ساحر لدھیانوی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لدھیانہ گورنمنٹ کالج کی "سرزمین پاک" میں ساحر کے شب و روز بھی ویسے ہی گذرے جیسے بعض نوجوانوں کے گذرتے ہیں لیکن ساحر شاعر بھی تھے اس لیے ان کا ماحول شعری فضا سے معمور رہا وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ لطیف جذبات و احساسات بھی رکھتے تھے اس لیے مضطرب بھی زیادہ ہوتے تھے اور لطف اندوز بھی زیادہ ہوتے تھے۔

کالج ان کے لیے وادی جمیل تھا، اس سرزمین پاک میں یارانِ نیک نام کا ساتھ رہا۔ اس "جنت خیال" میں انھوں نے زندگی کے چار سال گذارے۔ جہاں کی "نشاط خیز" فضا میں انھیں "گلہائے رنگ و بو" کے حسین کارواں نظر آتے تھے یہیں ہمارے شاعر نے پہلے یہیں وفا کے راگ الاپے، نغمات آتشیں، بکھیرے، یہیں سے ان کے یہاں سیاسی شعور بیدار ہوا وہ نئے نظام کی آمد کے لیے فکر مند ہوئے اور باغیانہ خیالات نے انھیں سرکشی پر مجبور کیا جس کا اعتراف ان کے کلام میں اس طرح ملتا ہے:

برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں ، سرکش بنے ہیں گیت بغاوت کے گائے ہیں

اور اس کے ساتھ اس کا علم بھی ہوتا ہے کہ:

نغمہ نشاط روح کا گایا ہے بارہا گیتوں میں آنسوؤں کو چھپایا ہے بارہا

یہ اشعار ۱۹۴۳ء کے ہیں اس سے تقریباً چار سال پہلے یعنی ۱۹۳۹ء میں لدھیانہ گورنمنٹ کالج کا دروازہ ساحر کے لیے کھلا تھا۔ گویا ان کی انیس سال سے چوبیس سال کی عمر کالج کی تعلیم میں صرف ہوئی۔ اس عمر اور زمانے میں وہ "معصومیوں کے جرم میں بدنام بھی ہوئے"، اور سیاسی شعور کے بیدار ہونے کی وجہ سے تیغ بے نیام بھی بنے۔ چنانچہ ان کی بیشتر شاعری ان کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے اور پھر جوں جوں عمر بڑھتی گئی، شعور جاگتا گیا۔ جذبات پختگی اختیار کرتے چلے گئے ان کا سماجی اور سیاسی شعور بڑھتا گیا، مستحکم ہوتا گیا۔ اب انھیں ترک محبت کا خیال کبھی آنے لگتا ہے لیکن محبت کا جذبہ غالب آجاتا ہے اور وہ کچھ شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور اپنی ندامت کو اس طرح چھپانے کی کوشش کرتے ہیں:

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو   دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے،

لیکن رفتہ رفتہ ایک دن ایسا آتا ہے جب ایام محبت اوراق پارینہ بن جاتے ہیں اور وہ انھیں صرف یاد کر کے تسکین پا لیتے ہیں یا بے چین ہو جاتے ہیں:

آتے ہیں جس دم یاد اب   کرتے ہیں دل ناشاد اب
گذری ہوئی رنگینیاں،   کھوئی ہوئی دلچسپیاں
پہروں رُلاتی ہیں ہمیں   اکثر ستاتی ہیں ہمیں
وہ زمزمے وہ چہچہے   وہ روح افزا قہقہے
جب دل کو موت آئی نہ تھی   یوں بے حسی چھائی نہ تھی
وہ نازنینانِ وطن   زہرہ جبینانِ وطن
جن میں سے ایک رنگین قبا   آتش نفس آتش نوا
کر کے محبت آشنا   رنگِ عقیدت آشنا
میرے دل ناکام کو   خوں گشتۂ آلام کو
داغ جدائی دے گئی   ساری خدائی لے گئی

اور ساحر لدھیانوی:

اُن ساعتوں کی یادیں   اُن راحتوں کی یادیں
مغموم سا رہتا ہوں میں   غم کی کسک سہتا ہوں میں

یہ تو غالباً عشق کی پہلی شکست تھی لیکن ساحر کی شاعری کے مطالعے سے بار ہا اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ بار بار وادی محبت میں داخل ہوئے اور بار بار انھیں ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس طرح ان کی زندگی کی غمناکی بڑھتی گئی پھیلتی گئی اور ایک حلقہ کو متاثر کرتی رہی لیکن جلد ہی زمانہ کے جور و ستم نے انھیں مضطرب کرنا شروع کیا، وہ مفلسوں کی بے چارگی، مزدوروں کی بدحالی، کسانوں کی پریشانی اور عام انسانوں کی الجھنوں، رسوائیوں اور زیادتیوں سے مضطرب رہنے لگے، رنجیدہ ہونے لگے چنانچہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

تمھارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے   نجات جن سے میں اک لحظہ پا نہیں سکتا

اب غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کا زور زیادہ ہوتا گیا، سماج کے کمزور پہلوؤں پر زیادہ نظر پڑنے لگتی ہے اضطراب اور زیادہ بڑھتا ہے، اور زیادہ شدید ہوتا ہے۔ غور و فکر کا مادہ بار بار کروٹیں لیتا ہے اور کبھی وہ یہ سوچ کر پریشان ہونے لگتے ہیں:

وہ گاؤں کی ہم جولیاں   مفلوک دہقاں زادیاں
جو دست فرط یاس سے   اور یورش افلاس سے
عصمت لٹا کر رہ گئیں   خود کو گنوا کر رہ گئیں
غمگیں جوانی بن گئیں   رسوا کہانی بن گئیں

کبھی وہ یہ دیکھ کر غم زدہ اور فکر مند ہو جاتے ہیں:

یہ اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پر بھوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں یہ افلاس اور بھوک کا شعور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ کارخانے میں لوہے کا شور و غل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ
یہ شاہراہوں پہ رنگین ساریوں کی جھلک
یہ جھونپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے

یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹریوں پہ غریبوں کے زرد زرد بچے

اور ــــــــ

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی چھائی ہوئی

یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں
خریدی جاتی ہیں اٹھتی جوانیاں جن کی

یہ بات بات پہ قانون و ضابطہ کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دور مجبوری

یہ غم بہت ہے مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

لیکن ایک دن وہ بھی آیا کہ حیات کے ماحول کی ناخوشگواری نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا :

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

اور پھر دنیا کی ناآسودگی، ناانصافی، نابرابری، طرح طرح سے انسان کی انسان کے ساتھ دشمنی، حکمرانوں کے طریقہ حکمرانی اور عوام کی بے بسی، بے کسی، عام عورتوں کی زندگیوں کے ساتھ امراء، رؤسا اور حکمرانوں کے کھلواڑ، ساحر کو اپنی طرف زیادہ توجہ کرنے لگتے ہیں اور وہ اپنی شاعری میں اُن کو زیادہ جگہ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں "چنانچہ" "مجھے سوچنے دو"، میں اپنے وطن کی خراب و خستہ حالت پر روشنی ڈالتے ہیں اور ہم وطنوں سے دلچسپی اور ہمدردی کا ذکر نہایت دردانگیز لہجہ کے ساتھ کرتے ہیں :

جلسہ گاہوں میں یہ دہشت زدہ سہمے انبوہ
رہگذاروں میں فلاکت زدہ لوگوں کے گروہ

بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیہ فام زمیں
تیرہ و تار مکاں، مفلس و بیمار مکیں

نوعِ انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد
امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد

ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلاب عظیم
نت نئے طرز پہ ہوتی ہوئی دنیا تقسیم

لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ جوانی کا سماں
اور دہقاں کے چھپر میں نہ بتی نہ دھواں

یہ فلک بوس ملیں دلکش و سیمیں بازار
یہ غلاظت پہ جھپٹتے ہوئے بھوکے نادار

"صبح نوروز"، میں بھوکے گداگر بچوں کے حال زار سے اس طرح آگاہ کرتے ہیں :

بھوکے زرد گداگر بچے

کار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں
پیپ بھری آنکھیں سہلاتے

وقت سے پہلے جاگ رہے ہیں
سر کے پھوڑے کو کھجلاتے
وہ دیکھ کچھ اور بھی نکلے
جشن مناؤ سال نو کے

اس کے بعد ساحر کبھی دنیا والوں کی غمناک زندگی سے الگ ہو کر اپنی محبت کی دنیا بسا نہ سکے اور انھوں نے اس کی کوشش بھی نہیں کی بلکہ ہوا یہ کہ ماحول کی غمناکی نے انھیں غمناک کیا، رنجیدہ دلوں نے رنجیدہ بنایا کرب سے بوجھل دنیا نے ان کے حصّے میں کربناکی دی اور وہ اُداس ہو گئے، فکرمند ہو گئے، مضطرب اور بےچین ہو گئے اور فریب شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے، حسن و عشق اور محفل رنگ و نشاط سے کنارہ کشی پر مجبور ہو گئے اور اس غم زدہ اور پریشان دنیا کی پریشانیوں اور دکھ درد کو اپنے کاندھوں پر لاد کر دنیا کو اس سے نجات دلانے کی فکر کرنے لگے چنانچہ انھوں نے بہ آواز بلند محبوب کو مخاطب کر کے کہا:

تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب
میری اُداس طبیعت ہے سب سے اکتائی
میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود ہی چھپائے تری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنت شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گذر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پرشکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پر بخشی طویل تنہائی
پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی
وہ پھر جھکا کسی در پہ غرور برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پر گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوت حلقۂ زنداں سے ایک گونج اٹھی
اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی

نہیں نہیں مجھے ملتفت نظر سے نہ دیکھ نہیں نہیں مجھے اب تاب نغمہ پیرائی

چنانچہ وہ دنیا والوں کو ان مجبوروں، مظلوموں اور پریشان حالوں کی طرف متوجہہ کرتے ہیں اور ان سے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں:

جابر و مظلوم کی باتیں کریں اس کہن دستور کی باتیں کریں
تاج شاہی کے قصیدے ہو چکے فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں
گرنے والے قصر کی توصیف کیا تیشۂ مزدور کی باتیں کریں

"کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ و پکار" نے ان کو بار ہا تڑپایا، اور جب کبھی "کسی مجبور کی جواں بیٹی بکی" تو وہ مضطرب ہو گئے اور دنیا کی ناانصافیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، لوگوں کو متوجہہ کیا، للکارا ان کی نظم "چکلے" اس کی بہترین مثال ہے طنز کے زہر میں بوجھل اس نظم نے نہ جانے کتنے حساس دلوں کو مضطرب کیا، تڑپایا، اور سڑے گلے معاشرے کے خلاف اکسایا ہے خاص طور سے اسکول اور کالج کے طلبہ پر اس کا جادو ایک زمانہ تک چلتا رہا ہے جس نے نوجوانوں کے دلوں میں سماج کے اس گھنونی زندگی میں مبتلا افراد سے ہمدردی پیدا کی ہے اور اس کے علاج کے لیے انھیں فکرمند کیا ہے اس موضوع پر ساحر سے پہلے بھی شعراء متوجہہ ہوئے ہیں کبھی ہمدردانہ روّیے کے ساتھ، کبھی بے رحمانہ انداز اختیار کر کے۔ لیکن ساحر کے احساسات اور اظہار کا انداز بالکل مختلف ہے انھوں نے اپنے تلخ احساسات اور مضطرب جذبات کے اظہار میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔ چنانچہ سچی تصویریں پیش کرنے میں اور عام انسانوں کے دلوں میں صالح جذبات بیدار کرنے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں، بڑی رواں دواں، بڑی پُر اثر اور تڑپانے والی یہ کارگر نظم اردو نظم کے سرمائے میں اپنا جواب نہیں رکھتی، یہ مناظر کس قدر حقیقت سے قریب اور دل آزار ہیں:

یہ پُر پیچ گلیاں، یہ بے خواب بازار یہ گمنام راہی، یہ سکّوں کی جھنکار،
یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

وہ اجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن تنفس کی الجھن پہ طبلے کی دھن دھن

یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن — ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

یہ پھولوں کے گجرے، یہ پیکوں کے چھینٹے ، — یہ بیباک نظریں ، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے — ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یہاں پیر بھی آچکے ہیں جواں بھی — تنومند بیٹے بھی ، ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے بہن بھی اور ماں بھی — ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

ذرا ملک کے رہبروں کو بلاؤ — یہ کوچے ، یہ گلیاں ، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ — ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں ؟

"طرحِ نو،، میں مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش جاری دکھائی گئی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا تختہ الٹنے کو بے بھوکے مزدور انتقام لینا چاہتے ہیں :

فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام — سرمایہ کے فریب، جہاں پروری کی خیر
طبقاتِ مبتذل میں ہے تنظیم کی نمود — شاہنشہوں کے ضابطۂ خود سری کی خیر

مزدور سے ہمدردی نے انھیں اشتراکیت کا ہمنوا بنا دیا تھا ، "طلوعِ اشتراکیت" اس کی مثال ہے۔ یہ پہلی نظم ہے جس میں کھل کر اشتراکیت کو "نیا سورج ،، کا نام دیا گیا ہے ، نظم اچھی ہے بڑی رواں ہے ، جوش و جذبات سے پُر ہے۔ اس میں مزدور طبقہ کی ترجمانی ملتی ہے ، مظلوموں کو بیداری کا احساس دلا دیا گیا ہے ، ایک نئے انقلاب کی آواز سنائی گئی ہے ، کسان مزدور ، مظلوم ، طبقہ نسواں ، بھوکے ننگے ، گداگر سب اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اپنا اپنا حق مانگ رہے ہیں اور پرانا نظام خوف زدہ ہے اور کانپ رہا ہے :

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں ، اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور ، دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں
جاگے ہیں افلاس کے مارے ، اُٹھے ہیں بے بس دُکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم ، آنکھوں میں بجلی کے شرارے

شاہی درباروں کے ڈر سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور بہمل دعوے ختم ہوئے ہیں
شور مچا ہے بازاروں میں ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا، غصب شدہ حق انسانوں کے
رسوا بازاری خاتونیں حق نسائی مانگ رہی تھیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں
جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکر بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر، ایک بھبھکتا شعلہ بن کر
کاندھوں پر سنگین کدالیں، ہونٹوں پر بیباک ترانے
دہقانوں کے دل نکلے ہیں، اپنی بگڑی آپ بنانے

ساحر کے شعری مجموعہ "تلخیاں"، کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو "طلوع اشتراکیت" سے پہلے ایک مختصر نظم "لمحہ غنیمت"، ملتی ہے جو آدھے درجن اشعار پر مشتمل ہے اور مکمل طور سے سیاسی ہے جس میں بغاوت کرنے کی دعوت دی گئی ہے:

مسکرائے زمین تیرہ و تار — سر اٹھائے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب — آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں — کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے
کوئی تیری طرف نہیں نگراں — یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں آہنی ہی سہی — آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں

فرصت یک نفس غنیمت جان
سر اٹھائے دبی ہوئی مخلوق

یا پھر "طلوع اشتراکیت"، سے پہلے بعض نظموں میں اس طرح کے اشعار پائے جاتے ہیں جن میں ساحر کے سیاسی شعور کی جھلکیاں نظر آتی ہیں:

ہمیں سے رنگ گلستاں ہمیں سے رنگ بہار — ہمیں کو رنگ گلستاں پر اختیار نہیں

یا میرے گیت میں:

مرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید مرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مجھے ہنگامہ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے
مری فطرت کو خوں ریزی کے افسانوں سے رغبت ہے
مری دنیا میں کچھ وقعت نہیں ہے رقص و نغمہ کی
مرا محبوب نغمہ شورِ آہنگ بغاوت ہے

لیکن دنیا ساحر کے بارے میں جو کچھ سوچتی اور سمجھتی تھی حقیقت ویسی نہیں تھی بلکہ جیسا کہ وہ خود بتاتے ہیں:

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں مفلسوں کو، بے کسوں کو بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدّد کو، امارت کے تکبر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دل تابِ نشاطِ بزمِ عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

ایک مختصر نظم ''کچھ باتیں'' کا ذکر آچکا ہے جس میں دیس کی ادبار کی باتیں بھی کی گئی ہیں اور اجنبی سرکار کی باتیں بھی دہرائی گئی ہیں، لیکن ہلکے پھلکے انداز میں، بس ایک نگاہ ڈالی گئی ہے اور اشارے کر دیئے گئے ہیں۔ ''البتہ گرنے والے قصر'' کی خوش خبری دی گئی ہے۔ لیکن ''طلوعِ اشتراکیت'' ان کی بھرپور سیاسی نظم ہے، جو زبان و بیان کے لحاظ سے اس لیے اہم ہے کہ اس میں بڑا جوش اور ولولہ ہے۔ عزم اور حوصلہ ہے۔ عام فہم زبان ہونے کے باوجود اس میں بڑا اثر، بڑی روانی اور نغمگی ہے اس نظم میں انھوں نے بغاوت کی اطلاع بھی دی ہے اور انقلاب کی خوش خبری بھی سنائی ہے اور پہلی بار بتایا ہے:

چوک چوک پر گلی گلی میں سرخ پھریرے لہراتے ہیں

تیرہ اشعار پر مشتمل یہ نظم اس وقت کے شاعر کے جذبات و احساسات اور سیاسی شعور سے متعارف کراتی ہے اور ساحر سے متعلق ادھورے نقوش میں رنگ بھرتی ہے ان رنگوں میں سرخی کو بھی اہمیت حاصل ہوتی نظر آتی ہے۔

جنگ عظیم میں غیر ملکی فوجی خاص طور سے امریکیوں کا بڑا زور تھا، وہ جہاں ٹھہرتے، جن ہوٹلوں میں قیام کرتے تھے ہندوستانیوں کا وہاں ہجوم سا لگ جاتا تھا، ان میں اکثر مصائب کے شکار غریب ان کے سامنے دست سوال بن جاتے اور وہ مغرور فوجی جوان احساسِ برتری کے تحت اکڑے، ٹیڑھے، ترچھے محسوس ہوتے:

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اونچے ہوٹل کے درِ خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے مرے محبوب وطن کی گلیاں
جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم
زرد چہروں پہ نقاہت کی نمود،
خون میں سیکڑوں سالوں کی غلامی کا جمود
علم کے نور سے عاری محروم،
فلک ہند کے افسردہ نجوم
جن کے تخئیل کے پر
چھو نہیں سکتے ہیں اس اونچی پہاڑی کا سرا
جس پہ ہوٹل کے دریچوں میں کھڑے ہیں تن کر
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
منہ میں سگریٹ لیئے ہاتھوں میں برانڈی کے گلاس
جیب میں نقرئی سکوں کی کھنک

. . . .

کچھ اشعار کے بعد یہ نظم نہایت تلخ ہو جاتی ہے:

اجنبی دیس کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکّہ، کوئی سگریٹ، کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جوٹھے ٹکڑے
چھینا جھپٹی کے مناظر کا مزہ لینے کو
پالتو کتّوں کے احساس پہ ہنس دینے کو
بھو کے مجبور غلاموں کا گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتا ہوا استادہ ہے
کاش! یہ بے حس و بے وقعت و بے دل انساں
روم کے ظلم کی زندہ تصویر
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے

....

ساحر نے اپنی نظم "شہزادے" میں ایک بار پھر فتح جمہور کی خبر دی ہے اور پھیلنے والی سرخ شعاعوں سے باخبر کیا ہے:

تیرگی ختم ہوئی سرخ شعائیں پھیلیں

"شعاع فردا" بھی سیاسی خیالات کی ترجمان ہے جس میں ایک بہتر مستقبل کے لیے ساحر پُر اُمید تھے، انھیں یقین تھا کہ کچھ دن بعد ہی انقلاب سے دوچار ہونا پڑیگا:

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اجالے کے لیے ترسے گا
اور کچھ دیر اٹھیگا دلِ گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا
اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک و سم افشاں سہی لیکن جی لے

۱۹۴۴ء میں بنگال کے قحط نے انھیں بے حد مضطرب کیا، اسی اضطراب نے ان سے "قحط بنگال" جیسی پُر اثر نظم لکھوائی جس میں زورِ بیاں بھی ہے اور جذبات کی فراوانی بھی:

یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کے مرے
ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لیے مالی نے خون سے سینچا تھا
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

پھر "فنکار" میں ایک بار پھر اس جہد آزادی اور سیاسی گرماگرمی اور سماجی بہتری کی تلاش کے دوران میں محبوب سے مخاطب ہو گئے ہیں:

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

اس لیے کہ:

مفلسی جنس بنانے پر اتر آئی ہے
بھوک تیرے رخ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے

"کبھی کبھی" میں یہی مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں:

عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ الم ہو کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

لیکن:

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گذر رہا ہوں کچھ انجانی رہ گذاروں سے

مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پُرہول خارزاروں سے

"فرار"، میں ساحر نے اپنے ماضی کو ذلت سے تعبیر کیا ہے "کل اور آج"، میں محنت کش کسانوں کے حال زار پر افسوس کیا ہے اور "ہراس" میں اپنے ایک نئے محبوب سے خدشات کا اظہار کیا ہے:

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم، وہ تکلم، تری عادت ہی نہ ہو

"اسی دوراہے پر"، ایک ایسی نظم ہے جس میں تجدید الفت کا اظہار کیا گیا ہے اور پھر پچھتاوا بھی ہے۔ ایک بار "تصویر رنگ"، میں محبوب سے شکایت کرتے ہوئے ملاقات ہوتی ہے:

تو نے سرمائے کی چھاؤں میں پنپنے کے لیے
اپنے دل اپنی محبت کا لہو بیچا ہے
دل کے تزئینِ فردہ کا اثاثہ لے کر
شوخ راتوں کی مسرت کا لہو بیچا ہے

"ایک شام"، میں ماحول اور ارد گرد کے حالات سے باخبر کیا گیا ہے:

چار جانب ارتعاشِ رنگ و بو
چار جانب اجنبی باہوں کا جال
چار جانب خوں فشاں پرچم بلند
میں، میری غیرت سراپا دست سوال
زندگی شرما رہی ہے کیا کروں

"احساس کامراں"، میں جیسا کہ حاشیہ پر درج ہے "دوسری جنگ عظیم میں نازی فوجوں کی شکست اور سوویت فوجوں کے جرمن سرحد عبور کرنے پر لکھی گئی ہے۔"،

"میں نہیں تو کیا"، خالص عشقیہ نظم ہے، جس میں محبوب جدا ہو کر کسی اور کا ہو گیا ہے لیکن سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود وہ غم زدہ اور غیر

مطمئن نظر آتا

"خودکشی سے پہلے" بھی عشقیہ نظم ہے جس میں ناکامی کا درد و کرب سمو دیا گیا ہے، لیکن غمِ جاناں نے جلد ہی غمِ دوراں کا رخ کر لیا ہے اور انسانی مصائب، ظلم و ستم کی کرب ناک جھلکیاں نظم کی تہہ سے ابل پڑی ہیں:

ظلم سہتے ہوئے۔ انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصور سے کہاں تک بہلے
عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

وہی ظلمت ہے فضاؤں میں ابھی تک طاری
جانے کب ختم ہو انساں کے لہو کی تقطیر

"یہ کس کا لہو ہے" ۱۹۴۶ء میں آزادیٔ ہند کی خاطر جہازیوں کی بغاوت کی ترجمان ہے جو خالص سیاسی نظم ہے اس بغاوت میں بے شمار فوجیوں کی جانیں وطن کے کام آ گئی تھیں، جس کا ساحرؔ کو شدید احساس تھا جس کی وجہ سے انھیں قومی رہنماؤں سے شکایت پیدا ہو گئی تھی چنانچہ اس نظم میں ان رہبروں سے اس طرح کے سوالات کیے گئے ہیں:

اے رہبرِ ملک و قوم ذرا
آنکھ تو اٹھا، نظریں تو ملا
کچھ ہم بھی سنیں، ہم کو بھی سنا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟

اور آخر میں ساحرؔ نے اپنے عزم کا اعلان اس طرح کیا ہے:

ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
تم سمجھوتے کی آس رکھو ہم آگے بڑھتے جائیں گے
ہر منزلِ آزادی کی قسم ہر منزل پر دہرائیں گے

"میرے گیت تمھارے ہیں" میں کسانوں اور مزدوروں کا ساتھ دینے کا

نیا عزم ہے، معلوم نہیں اس میں ہندی کے الفاظ زیادہ کیوں استعمال کیے گئے ہیں
جس نے نظم کی روانی اور شیرینی چھین لی ہے وہ اعلان کرتے ہیں:

آج سے اے مزدور و کسانو! میرے راگ تمھارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بھاگ تمھارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو، یہ شعلے خاموش نہ ہوں گے
جب تک بے آرام ہو تم، یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے

"جاگیر" میں طنزیہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے اس نظام
کی قلعی کھلتی ہے اور دل میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔
جاگیردارانہ نظام نے ملک کے جمہور کو بڑا نقصان پہنچایا ہے خاص طور سے مزدوروں
کو کسانوں کو اس فرسودہ نظام کے تحت صدیوں سے کچلے اور دبائے رکھا گیا اور
ان کا استحصال کیا گیا۔ اُن کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی تھی نہ ان کی محنت و مشقت،
نہ پیداوار، کچھ بھی نہیں، سب آقاؤں کی باپ دادا سے ملی ہوئی جاگیریں ہوتی
تھیں۔ یہ ان کی خوشیوں کے لیے زندہ رہتے تھے۔ ایک جاگیردار کا یقین ہوتا تھا:

ان کی محنت بھی مری حاصل محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے قوّت بازو بھی مری
میں خداوند ہوں اس وسعت بے پایاں کا
موج عارض بھی مری نکہت گیسو بھی مری

اور کسانوں کی حالت زار سے بھی اس طرح آگاہ کرنے کی کوشش کی
گئی ہے کہ دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے:

خاک میں رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں
ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ پڑتا ہے
ان کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

"مادام"، ایک ایسی نظم ہے جس میں ہندوستان کی غربت اور افلاس کی
وجہ سے جو برائیاں پیدا ہوئی ہیں انھیں کو تہذیب و ادب اور تعلیمی میدان میں

ہندوستان کے پچھڑے رہنے کی وجہ قرار دی گئی ہے ۔ یہ کہنا بہت حد تک درست ہے کہ :

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جن حالات میں اور جس طرح ہندوستان آزاد ہوا ، اس کو ساحر اور ان کے ہم خیال بہتوں نے پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور مفاہمت کا نام دیا ۔ چنانچہ صاف صاف کہا :

یہ جشن ، جشن مسرت نہیں تماشہ ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنوں کا جلوس
ہزار شمع اخوت بجھا کے چمکے تھے
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسین فانوس

" مفاہمت " ہی کا دوسرا حصہ اُن کی طویل " نظم " آج " ہے جو انھوں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے پیش کی تھی ، یہ نظم نہایت غمناک ہے ، آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان میں جو انسانوں کا خون بہایا گیا اور تباہیاں مچائی گئیں اور ملک کے نام کو رسوا کیا گیا ، اس نے ہمارے شاعر کو مغموم بھی کیا مضطرب بھی بنایا ، وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے :

ساتھیو ! آج تم نے بھسم کر دیا ہے
اور میں ۔ اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انسان کی حیوانیت جاگتی ہے
بربریت کے خوں خوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے

خون پی پی کے غرا رہے ہیں
بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشاں ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خون کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
دربدر پھر رہا ہوں
مجھ کو امن و انصاف کی بھیک دو

بروقت کہی گئی یہ نظم نہایت پُرتاثیر ہے اور وطن کے لیے اہل وطن کے لیے، ماؤں کے لیے، بچوں کے لیے محبت کا جذبہ، بیدار کرتی ہے، یہ سب کچھ اس نظم میں اس لیے ہے کہ خود ساحر کو وطن سے بے حد محبت تھی جس نے ان حالات میں انھیں مضطرب کر دیا لیکن ہوش کھونے کے بجائے ہوش پر قابو پانے میں وہ کامیاب ہو گئے تھے۔

"نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو"، بھی سیاسی نظم ہے جس میں آزادی کے بعد یہ احساس دلایا گیا ہے کہ پرانے رہنماؤں کی ضرورت نہیں رہی ہے، اس لیے کہ وہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہی حصول مقصد میں ناکام ہو گئے اور سارے ملک میں تباہی مچ گئی، یہ نظم بھی "مفاہمت" اور "آج"، کا حصّہ ہے۔ آخری بند میں اہل وطن کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھا کے چلو
پرانے راہنما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوعِ صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دلارے اِدھر نہ دیکھیں گے

"لہو نذر دے رہی ہے حیات"، سیاسی نظم ہے۔ جس میں آزاد ہندوستان

میں ایک خاص نظریہ کے ماننے والے کو جب قید و بند اور جبر و تشدّد کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا تو ساحر کو کہنا پڑا:

مگر مٹے ہیں کہیں جبر اور تشدّد سے
وہ فلسفے کہ جلا دے گئے دماغوں کو

اور "اشتراکیت" کی مقبولیت کی طرف بھی یہ کہتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں:

ابھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم
کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں

"متاعِ غیر" ایک عاشقانہ نظم ہے جس میں شاعر اپنے محبوب سے پوچھتا ہے کہ:

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گذر ہے کہ نہیں

پوری نظم اسی خیال کے تانے بانے سے مکمل ہوئی ہے اور ایک ہلکی سی کسک دل و دماغ پر چھوڑتی ہے۔ "آوازِ آدم" میں حکومت سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے:

مکافاتِ عمل، تاریخِ انساں کی روایت ہے
کرو گے کس طرح نادک فراہم ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک ہے تمہارے ظلم میں دم ہم بھی دیکھیں گے

"بشرطِ استواری" میں شاعر نے جمہور سے وفادار رہنے کا اعلان "میں تمہارا ہوں لیڈروں کا وفادار نہیں" کہہ کر کیا ہے۔ "خوبصورت موڑ" بھی ایک پیاری سی رومانی نظم ہے جس میں محبوب سے اجنبی بننے کی خواہش ظاہر کی گئی ہے اور اختتام نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس بند پر کیا گیا ہے:

تعارف روگ ہو جائے تو اسکو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے تکمیل تک لانا نہ ہو ممکن
اسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

اس مجموعہ کی دو اہم نظمیں "تاج محل" اور "نور جہاں کے مزار پر" رہی جاتی ہیں دونوں کا تعلق مغل شہنشاہوں سے یعنی جہانگیر اور شاہجہاں سے ہے نور جہاں سے جہانگیر کی محبت کا کیا حال تھا یا شاہجہاں کو ممتاز محل سے کتنا قلبی لگاؤ تھا اس سے کون واقف نہیں ہے، لیکن دونوں بادشاہ تھے بادشاہوں سے ساحر کو شدید اختلاف تھا۔ اس لیے "نور جہاں" ان کو مظلوم نظر آئی اور تاج محل ان کی نظر میں شہنشاہیت اور مظلومیت کی علامت بن گیا۔ اُن دونوں نظموں کا تعلق فکر سے زیادہ جذبات سے ہے جو ایک خاص نظریہ، ایک مخصوص فکر اور رُومی کی دین ہے اس لیے ایک خاص ماحول میں خاص طور سے "تاج محل" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے یہ اشعار تو ایک مدت تک نوجوانوں کی زبان پر رہا کیے :

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

اس مجموعے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں کچھ اشعار ایسے ہیں جن کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ساحر کو دیہات، اس کے قدرتی مناظر، وہاں کی سیدھی سادی زندگی اور طور طریقہ سے گہرا لگاؤ تھا، اس کی وجہ شاید کسانوں اور مزدوروں سے اُن کی گہری رغبت ہو سکتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

افق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا — فضا تن گئی راستے مسکرائے
سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر — جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے — پراسرار لے میں رہٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے — لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے
بادل یہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے ہیں — دوش ہوا پر میخانے ہی میخانے گھر آئے ہیں
رت بدلے گی پھول کھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے — اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگین آنچل لہرائیں گے

چرواہے بنسی کی دھن سے گیت فضا میں بوئیں گے
آموں کے جھنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھوئیں گے
ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں کو ذرا جھوم تو لوں

البتہ بعض نظموں میں بعض ایسے ہندی کے الفاظ بھی شامل ہو گئے ہیں جو مناسب نہ تھے جن سے اشعار کی روانی زبان کی شیرینی اور اثر و تاثیر کو نقصان پہنچا ہے۔ دیکھیے یہ الفاظ کیسے کھدرے اور اردو کے لیے اجنبی ہیں:

جیسے: کارن، جیون، جیوٹ، دھارے، اندھیارے، پتھ
دھرتی، ارپن، جوگ، بھاگ، انگارے، بھسم وغیرہ

مجموعی طور سے ساحر کے کلام کا یہ مجموعہ ان کے عاشقانہ جذبات اور سیاسی افکار کی تلخیوں سے تلخ تر ہو گیا ہے، لیکن ان تلخیوں میں بھی ایک خاص لذت ہے۔ اس لیے بار بار مطالعہ کے باوجود اس کا اثر زائل نہیں ہوتا، بلکہ عجیب کیفیت چھوڑ جاتا ہے اور جس کی تلخی دیر تک دل و دماغ کو متاثر اور مضطرب رکھتی ہے، لیکن ساحر کی شاعری کا جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں کہا جا سکتا ہے، جب تک ان کی طویل نظم "پرچھائیاں" کا بھی مطالعہ نہ کیا جائے۔

دراصل "پرچھائیاں"، ساحر کی نہایت رواں دواں اور فکر انگیز طویل نظم ہے جسے پُر اثر اور پُر کیف بنانے اور اپنی بات نئے ڈھنگ سے کہنے کے لیے بار بار بحروں کو تبدیل کرنے کا تجربہ کیا گیا ہے جس کے ذریعہ ساحر کے ماضی کے حسین اوراق پلٹے گئے ہیں اور جنگ کے بھیانک مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں اور مستقبل کو جنگ کے مہیب اور تباہ کن حالات سے بچانے کے لیے بھی آواز بلند کی گئی ہے۔ اس نظم کے متعلق خود ساحر لدھیانوی کا یہ کہنا بجا ہے:

"...... اس وقت ساری دنیا میں امن اور تہذیب کے تحفظ کے لیے جو تحریک چل رہی ہے یہ نظم اس کا حصہ ہے۔"

اور بلاشبہ ساحر اس نظم کے ذریعہ امن اور تہذیب کے تحفظ کی تحریک کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کی اردو کی یہ پہلی طویل نظم ہے جس

نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے یہ نظم ساحر کے فکر و خیال سے آگاہ کرنے اور ماضی و حال سے روشناس کرنے میں بھی مدد کرتی ہے۔ جو عرصہ تک بہت مقبول رہی ہے خاص طور سے اس کا یہ آخری بند تو آج ۳۲ تیئس سال گذرنے کے بعد بھی لوگوں کی زبان پر ہے۔

گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

کاش ساحر اور زیادہ طویل عمر پاتے اور کئی ایسی طویل نظمیں کہہ جاتے، تو اردو کے شعری خزانے میں اور زیادہ گرانقدر اضافہ ہوتا

(ساحر لدھیانوی نمبر۔ فن اور شخصیت بھی فروری ۱۹۸۵ء)

جاں نثار اختر کی غزلیں

(۱)

جاں نثار اختر ترقی پسند شاعروں کی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جس میں مجاز، فیض، جذبی، مخدوم، سردار وغیرہ شامل تھے لیکن ان کی آواز ان شعرا سے بہت کچھ مختلف رہی ہے، ان کے یہاں لہجے میں نرمی اور شگفتگی ہے۔ تیزی اور چڑمردگی نہیں رہی ہے وہ عام فہم نکھرے، صاف ستھرے اور دلنشیں الفاظ، تشبیہات، تمثیلات، ترکیبات استعمال کرتے ہیں ان کے بیان میں جلال نہیں ہے جمال کارفرما ہے۔ ان کی شاعری کی عام فضا دل کی دنیا ہے، آب و گل کی دنیا نہیں، یعنی غم جاناں کا اثر ان کے یہاں غالب ہے، غم دوراں کا کم کم، البتہ یہ ضرور رہا ہے کبھی دل کی دنیا سے فرصت ملی اور دنیائے آب و گل کی سیر کرلی، تب ان کی شاعری کبھی پرچم بنتی ہے، کبھی تلوار کی باڑھ کا کام کرنا چاہتی ہے اور وہ غلامی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، ظلم اور جبر کو دھتکارتے ہیں، مظلوم کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ مفلس اور مزدور کے درد کو اپنا درد بنا لیتے ہیں اور ان کے لیے فکر مند اور بے چین نظر آتے ہیں۔

انھوں نے شاعری اس وقت شروع کی جب جوانی سے طفلی گلے ملتی ہے، چنانچہ ان کی اس دور کی شاعری جوانی دیوانی کی شاعری ہے حسن و عشق کی شاعری ہے شراب و شباب کی شاعری ہے، سرمستی و بدمستی کی شاعری ہے احساس و جذبات کی شاعری ہے، خلوص اور سچائی کی شاعری ہے، اسی شاعری کی وجہ سے وہ مقبولیت اور محبوبیت کے قلمرو میں داخل ہوئے اور دوستوں میں، ہم جماعتوں میں، یونیورسیٹی میں، یونیورسیٹی کے باہر دنیا میں اور سارے ہندوستان کے نوجوانوں تک ان کی شہرت پہنچی

اور ان کی شاعری نے اُن سے جاں نثار اختر کے لیے خراج عقیدت اور لازوال محبت حاصل کی لیکن یہ سب کچھ اُن کی عشقیہ نظموں کی وجہ سے ہوا، غزلوں کی وجہ سے نہیں، حالانکہ انھوں نے شاعری کی ابتدا غالباً غزل گوئی ہی سے کی۔

باپ مضطر خیر آبادی، غزل کی دنیا، غزل کا ماحول، غزل کا مزاج، ایسی فضا اور گرد و پیش ہی میں انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی اور دل کھول کر اس میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ماحول، مزاج اور غزل سے ابتدا کے باوجود وہ غزل کو اتنا کچھ نہ دے سکے جتنے کی اُن سے توقع کی جا سکتی تھی اور غزل کے سرمائے میں ویسا اضافہ نہ کر سکے جیسے کی اُن سے امیدیں وابستہ تھیں۔

انھوں نے پہلی غزل ۱۹۳۴ء میں کہی، اور آخری غزل جو مطبوعہ صورت میں ملتی ہے ۱۹۷۰ء کی ہے۔ اس طویل عرصہ میں یعنی تقریباً ۳۷ سال کی مدت میں انھوں نے کل بیس۲ غزلیں کہی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بیس۲ غزلیں اس عرصے میں ان کی نظموں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں ممکن ہے اور بھی غزلیں کہی ہوں لیکن وہ کسی وجہ سے منظر عام پر نہیں آ سکی ہیں یا ایسے رسائل میں شائع ہوئی ہیں جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔

پہلی غزل جو انھوں نے تقریباً بیس۲ سال کی عمر میں کہی ہے مطالعہ کیجیے اور ان کی قدر و قیمت اور رنگ و آہنگ کا اندازہ لگائیے۔

ہائے اُن کی عمر کا رنگین نظام	بتکدے کی صبح، مے خانے کی شام
ہائے وہ تسلیم محبت کی ادا	ہائے وہ شرمایا ہوا اُن کا سلام
ہائے وہ راتوں کی دوہری چاندنی	وہ جمالِ دوست وہ ماہِ تمام
دو دلوں کا وہ تصادم ہائے ہائے	جیسے مے خانے میں ٹکراتے ہوئے جام

پوری غزل حسن و عشق کے جذبات، کیفیات، حالات اور اضطراب میں ڈوبی ہوئی ہے بتکدے کی صبح، مے خانے کی شام، شرمایا ہوا سلام، دوہری چاندنی، جمالِ دوست، ماہِ تمام، ٹکرائے ہوئے جام، قصہ تمام وغیرہ نے غزل کی تکمیل اور اس کی فضا کی تعمیر کی ہے بیس۲ سال کے نوجوان کی شاعری میں کسی اور بات کی

تلاش کیا معنیٰ، یہ غزل اپنی پوری روایت، مزاج رنگا رنگی اور طرب ناکی ہر اعتبار سے مکمل ہے، پُرکشش ہے، پُرتاثیر ہے مرصع اور پاکیزہ ہے، اس میں میرؔ کا غم نہیں مصحفیؔ کا سوز و گداز نہیں، جرأتؔ کی معاملہ بندی نہیں، انشاؔ کی شوخی نہیں، مومنؔ کی لذت پرستی نہیں، غالبؔ کا فلسفہ نہیں، داغؔ کی عیش پسندی نہیں، فانیؔ کی قنوطیت نہیں لیکن پھر بھی یہ غزل اپنی پہچان رکھتی ہے اور بہت خوب ہے۔ یہ جاں نثار اختر کے پختہ شعور کی ترجمانی کرتی ہے اس لیے اپنی طرف کھینچتی ہے اور نور و نکہت، کیف و مستی کی فضا میں چھوڑتی ہے۔ اس کے بعد دو غزلیں ایک ۱۹۳۵ء کی ؎

دور کوئی رات بھر گاتا رہا تیرا ملنا مجھ کو یاد آتا رہا

اور دوسری غزل ؎

مے کشی اب میری عادت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ بھی ایک تلخ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

ملتی ہیں۔

پہلی غزل چھ شعروں پر مشتمل ہے اور رواں دواں ہے۔ یہ اپنے وقت میں مقبول رہی ہے اس میں سیدھے سادے الفاظ میں وہی حسن و عشق کی بے تابیاں اور بے قراریاں پائی جاتی ہیں غم اور ضبط غم کا اظہار ملتا ہے۔ دوسری غزل میں صرف چار اشعار ہیں لیکن ۱۹۳۵ء کی غزل کی بات نہیں ہے۔ اس قدر رواں دواں بھی نہیں ہے۔ اس میں ترقی پسند شاعری کے اثرات بھی نمایاں نہیں ہیں حالانکہ اس غزل میں اس بات کی اُمید کی جا سکتی تھی، وہی قدیم غزل کا انداز، البتہ اس غزل میں شاعر پہلی بار اپنے بارے میں اعلان کرتا ہے ؎

میری دنیا میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ صرف شاعرانہ خیال نہیں بلکہ حقیقت ہے،

یہ بات حیرت کی ہے کہ ۱۹۴۴ء کی غزل ؎

ہائے وہ اک رات، ساحل، راگنی مہتاب تم
بن گئے میرے لیے کیسا سہانا خواب تم

اس دور کے سیاسی اثرات سے پاک ہے اور اس وقت کا ہندوستان

جس کرب، اضطراب اور کشمکش میں مبتلا تھا اس میں اس کا کسی قسم کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا، حالانکہ اس وقت تک اردو غزل سیاسی شعور اور معاشرتی تقاضوں سے اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھی بلکہ اس کے برخلاف وہی حسن وعشق، اس کی بے تابیاں، بے قراریاں، رات، ساحل، راگنی سہانا خواب، مہتاب، شب مہتاب، ستاروں کے چراغ، ویران آنکھیں زرد چہرہ، خشک ہونٹ، وفا کی بستی جنوں کے دیس وغیرہ کے گرد پوری غزل رقص کرتی ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس غزل نے انھیں نئی فضا میں داخل کیا ہے۔ اب ان کے اشعار میں زبان، بیان انداز اور لہجے میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے اثرات معلوم نہیں کیوں اب بھی کچھ دبے دبے سے ہیں اور وہی عاشقانہ مزاج اپنے اندر دلکشی، دلفریبی اور بے قراری چھپائے ہوئے ہے۔

اس کے بعد پہلی غزل جو انھوں نے آزاد ہندوستان میں کہی ہے اس کا مطلع ملاحظہ فرمائیے:

ساز بے مطرب و مضراب نظر آتے ہیں   پھر بھی نغمے ہیں کہ بیتاب نظر آتے ہیں

اس غزل کے مطالعہ سے پہلی بار شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی غزل کا مزاج نمایاں طور سے بدل چکا ہے۔ اب وہ اپنی غزل میں نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں:

وہی محفل ہے وہی رونق محفل لیکن   کتنے بدلے ہوئے آداب نظر آتے ہیں
کیا تماشہ ہے کہ غنچے تو ہیں پژمردہ و زرد   خار آسودہ و شاداب نظر آتے ہیں
قافلہ آج یہ کس موڑ پر آ پہونچا ہے   اب قدم اور بھی بے تاب نظر آتے ہیں
کل کریں گے یہی طغیان گل تر پیدا   آج جو آگ کے سیلاب نظر آتے ہیں
مسکراتے ہوئے فردا کے افق پر اختر   ایک کیا سینکڑوں مہتاب نظر آتے ہیں

اس غزل کے علاوہ "جادواں" میں سات غزلیں ہیں جن میں یہی رنگ اور مزاج ملتا ہے اور احساس کی یہی شدت اور کیفیت پائی جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ان میں غم جاناں کے اثرات کم کم ہیں اور غم دوراں کا دور دورہ نظر آتا ہے:

سمندر کو یقیں آئے گا کس دن — کہ ساحل سے بھی اٹھ سکتے ہیں طوفاں
یہ عالم ہے ابھی تمہیدِ عالم — یہ انساں ہے ابھی امیدِ انساں
یہ گل بھی زخم ، یہ شبنم بھی آنسو — مجھے دھوکہ نہ دے فصلِ بہاراں
سازِ مطرب کچھ نہیں ہے جامِ ساقی کچھ نہیں — زندگی ہے آپ نغمہ زندگی ہے خود شراب

آج ذرے دکھا رہے ہیں چراغ — کل دکھائی تھی راہ تاروں نے
ایک عہدِ طرب کی دی ہے نوید — غمِ گیتی کے رازداروں نے

ستارے ، شفق ، چاندنی سرد ، پھول — نظر تجھ پہ ٹھہری ہزاروں کے بعد
گیا دورِ دورِ بہار و خزاں — بہاریں ہیں اب تو بہاروں کے بعد

فرصتِ عشق بھی نہیں حاصل — آج انسان ہے بہت مشغول
ہجر کی داستان رہنے دے — کون دے اب ذرا سی بات کو طول
مرحبا انقلاب آپہنچا ، — وہ جواں سال عصرِ نو کا رسول

ذرہ ہائے چمن کو یکجا کر — پھینک اوراقِ گل کا شیرازہ
صبحِ نو کی بارات آتی ہے — کون روکے گا آج دروازہ

"جادواں" کی یہ تمام غزلیں جو ۱۹۴۸ء اور اس کے قریب کے زمانے کے نئے رجحانات ، نئے حالات ، نئے مسائل ، نئے موضوعات ، نئے جذبات ، نئے احساسات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں اور ساز دوراں ، ماہ تاباں ، اہلِ جنوں ، گریباں ساحل ، سمندر ، نوائے ساز ، اوراقِ گل ، بوئے گل گل ، زخم ، شبنم ، آنسو ، ذوقِ تجسس ، نگاہِ شوق ، ماہ انجم ، آفتاب ، جام ، ساقی ، ساز ، مطرب ، شراب ، شورش ، بحر ، چراغ ، غمِ گیتی ، میکدہ ، بادہ خوار ، ستارے ، شفق ، چاند ، چاندنی ، سرو ، پھول بہار و خزاں ، کشتی متلول ، دھول ، ذرہ ہائے چمن ، صبحِ نو ، وغیرہ الفاظ نئے معنوں اور اشاروں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں

اور شاعر ہجر و وصل کی الجھنوں سے نکل کر زندگی کے روز و شب اور ان کے مسائل سے دوچار نظر آتا ہے اور اس طرح وہ دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح غزل کے دامن کو وسیع کرنے اور اسے نئی سمتوں کی طرف موڑنے میں کوشاں اور کامیاب نظر آتا ہے۔

اس کے بعد ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۰ء تک کی آٹھ غزلیں انتخاب انجمن ترقی اردو "اور خاک دل"، میں شائع ہوئی ہیں۔ اس دوران میں ان کی غزل گوئی نے ایک اور کروٹ لی، غم دوراں کے اثرات گھٹنے اور غم جاناں کا زور بڑھنے لگا۔ البتہ آخری تین غزلوں میں غم دوراں پھر چٹکیاں لینے لگتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے ذیل کے اشعار ان کے دونوں قسم کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں:

دل کو ہر لمحہ بچاتے رہے جذبات سے ہم ‏ اتنے مجبور رہے ہیں، کبھی حالات سے ہم
نشہ مئے سے کہیں پیاس بجھی ہے دل کی ‏ تشنگی اور بڑھا لائیے خرابات سے ہم

جب بھی ہنگامۂ دار و رسن آ گیا ‏ ہم میں کچھ اور بھی بانکپن آ گیا

دیس سے جب پردیس سدھارے ہم پر یہ بھی وقت پڑا
نظمیں چھوڑیں غزلیں چھوڑیں، گیتوں کا بیوپار کیا

آراستہ بدن پہ ہیں زخموں کے پیرہن ‏ شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں
کیا یوں ہی جگمگائے ہیں منزل کے راستے ‏ لاکھوں چراغ خون شہیداں سے آئے ہیں

غم جہاں سے بھی دل کو لگا کے دیکھ ذرا ‏ غم بہار و غم یار ہی نہیں سب کچھ

جاں نثار اختر کی غزلوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری کی زندگی اگرچہ بہت طویل ہے لیکن نظموں کے مقابلہ میں انھوں نے بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ حالانکہ اچھی غزلیں کہنے کی ان میں پوری صلاحیت تھی اور ہے اور وہ نئے نئے تجربے سے اسے چمکانے اور آراستہ پیراستہ کرنے کا

سلیقہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو سمجھا اور برتا اور اپنے تجربوں سے باوقار بنایا، موضوعات، مضامین اور فکر وخیال میں ندرت اور جدت پیدا کی اور اس طرح اس کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے کی کوشش کی۔ اس لیے عام روش کو چھوڑ کر اور کمیت کے باوجود کیفیت کے پیش نظر جہاں ہم ان کی نظموں کو پرکھ کر ان کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں اُن کی غزلوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے، اور ان کے پیشروؤں اور ہم عصروں کے درمیان ان کی غزلوں کی قدر وقیمت اور انفرادیت کی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔

(۲)

اس مضمون کے پہلے حصہ میں ۱۹۷۰ء تک کی غزلوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے میں ان کے نئے مجموعہ "پچھلے پہر" کی غزلوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ممکن ہے ۱۹۷۵ء کی غزلیں بھی اس میں شامل ہوں)

ان غزلوں میں سنجیدگی، وزن اور وقار ہے، اچھی زبان ہے پاکیزہ خیالات ہیں، فکر میں گہرائی ہے لہجے میں بانکپن ہے۔ شگفتگی ہے اور اثر وتاثیر ہے ان میں ان کے زمانے کی، ان کے معاشرے کی زندگی مسکراتی ہوئی، مچلتی ہوئی، مہکتی ہوئی، دمکتی ہوئی، تڑپتی ہوئی ملتی ہے۔ حسن وعشق اور اس کے کیفیات وجذبات کا اظہار نہایت بانکپن کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جاں نثار کے تجربہ، شعور، احساس اور ذوق جمال نے ان اشعار کے پردے میں نئی بات پیدا کی ہے اور کہیں صداقت کا دامن چھوٹنے نہیں پایا ہے ان اشعار میں سرمستی، بدمستی، سوز وگداز، عشق کی باتیں، حسن کی گھاتیں بڑی دلنواز انداز میں ملتی ہیں ملاحظہ کیجیے:

کم نہیں نشے میں جاڑے کی گلابی راتیں
اور اگر تیری جوانی بھی ملا دی جائے

دل کو چھو جاتی ہے یوں رات کی آواز کبھی
چونک اٹھتا ہوں کہیں تو نے پکارا ہی نہ ہو

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

میں جب بھی اس کے خیالوں میں کھو سا جاتا ہوں
وہ خود بھی بات کرے تو برا لگے ہے مجھے

یہ اشعار نئے انداز، نئے جذبات، نئے تجربات اور حسن وعشق کی ایسی کیفیات کو ظاہر کرتے ہیں جو دلوں کو چھو جاتی ہیں اور اپنے اثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ اختر کی یہ بھی

انفرادیت اور خوبی ہے کہ اردو غزل جس میں عام طور سے محبوب کو تذکیر کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے ان کے یہاں اس طرح کے اشعار ملتے ہیں جن میں محبوب صنفِ نازک کے سوا کوئی اور نہیں ہے بلکہ ہمارے معاشرے کی ہی کوئی زہرہ جبیں یا حسن مجسم ہے :

دبا کے آئی ہے سینہ میں کون سی آہیں
کچھ آج تیرا رنگ سانولا لگے ہے مجھے

کچھ اور اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں احساس، جذبات اور حسن و جمال کے اچھوتے پیکر تراشے گئے ہیں اور پھر جوانی کی سرشاریوں نے، شباب کی رنگینیوں نے اور حسن کی اٹھکھیلیوں نے، کبھی شرما کر کبھی لجا کر، کبھی جوانی کی ترنگ میں ڈوب کر اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، آمنے سامنے، چھپتے، چھپاتے کیا کیا نہ ستم ڈھائے ہیں اور شاعر کو اضطراب کی دنیا میں چھوڑ گئے ہیں کہ کبھی وہ اس چوٹ کو محسوس کرتے ہوئے بے قرار ہو جاتا ہے اور کبھی اس کی یادوں سے لطف اندوز ہوتا ہے :

شگفتہ پھول سمٹ کر کلی بنے جیسے
کچھ اس کمال سے تو نے بدن چرایا تھا

ہمیں کو فرصتِ نظارگی نہیں ورنہ
اشارے آج بھی کرتی ہیں کھڑکیاں ہم سے

آج تک چوٹ دبائے نہیں دبتی دل کی
کس طرح اس صنمِ سنگِ بدن کو بھولیں

اور تہذیبِ غمِ عشق نبھا دیں کچھ دن
آخری وقت میں کیا اپنے چلن کو بھولیں

آنکھیں اٹھیں تو درد کے چشمے ابل پڑے
پلکیں جھکیں تو پیار کا بادل برس گیا

دیکھا جو آنکھ بھر کے تو بازو سمٹ گئے
باہوں میں بھر لیا تو بدن اور کس گیا

تیری زلفیں، تیری آنکھیں، ترے ابرو، ترے لب
اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح

حال کہنا ہے کسی سے تو مخاطب ہے کوئی
کتنی دلچسپ ہوا کرتی ہیں باتیں اکثر

زلفیں، سینہ، ناف، کمر،
اک ندی میں کتنے بھنور

لاکھ طرح سے نام ترا
بیٹھا لکھوں کاغذ پر

تو کبھی راگ کبھی رنگ کبھی خوشبو ہے
کیسی کیسی نہ تجھے عشوہ گری آوے ہے

حوصلہ کھو نہ دیا تیری نہیں سے ہم نے
کتنی شکنوں کو چنا تیری جبیں سے ہم نے

لہجہ کا کرشمہ ہے کہ آواز کا جادو
وہ بات بھی کہہ جاتے میرا دل بھی دکھے نا

مانا کہ رنگ رنگ ترا پیرہن بھی ہے
پر اس میں کچھ کرشمۂ عکسِ بدن بھی ہے

مندرجہ ذیل غزل مسلسل ہے جس میں محبوب کے حسن و جمال اور نور و نکہت کی دلنواز تصویریں تراشی گئی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو　　سایہ کوئی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں　　شرمائے لچک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
صندل سی مہکتی ہوئی پرکیف ہوا کا　　جھونکا کوئی ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جاں نثار اختر کی نظمیں خاص طور سے عشقیہ جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں جس کی وجہہ سے ان کی شاعری خصوصاً نوجوانوں میں مقبول رہی ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی عام فضا یہی ہے ان کے یہاں سادگی اور صداقت ہے، خیالات میں ندرت ہے انداز میں جدت ہے اور احساس میں شدت پائی جاتی ہے، لیکن "پچھلے پہر" کی غزلوں میں پختہ عمر، پختہ شعور اور پختہ تجربات کا احساس ملتا ہے چنانچہ عشق، اس کی کیفیات اور حسن اور اس کی بے پناہ دلربائیوں کے باوجود، اظہار میں ٹھہراؤ، سنجیدگی، شائستگی کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان سے ہٹ کر بھی ان میں کیا کیا نہیں ہے، ان میں اس جہان آب و گل کی حقیقتیں ہیں، معاشرے کی جھلکیاں ہیں، زندگی کی کامرانیاں ہیں، ناکامیاں ہیں، سسکیاں ہیں اور شاعر کے تجربات، تصورات اور تاثرات کی ایک دنیا آباد ہے:

زندگی یہ تو نہیں تجھ کو سنوارا ہی نہ ہو　　کچھ نہ کچھ ترا قرض اتارا ہی نہ ہو
ہر ایک روح میں ایک غم چھپا لگے ہے مجھے　　یہ زندگی تو کوئی بددعا لگے ہے مجھے
اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس لگے　　زندگی رام کا بن باس لگے

اور آخر وہ تجربے کی اس منزل پر پہنچ کر بڑی جرأت مندی سے کچھ انمول باتیں کہہ جاتے ہیں:

زندگی جس کو ترا پیار ملا وہ جانے　　ہم تو ناکام رہے چاہنے والوں کی طرح
ہاں خبردار! کہ اک لغزش پا سے بھی کبھی　　ساری تاریخ کی رفتار پلٹ جاتی ہے

صفحہ ۱۴۱ پر چھوٹی مگر دلنشیں بحر میں پوری غزل حسن و عشق کی باتیں کم کرتی ہے، لیکن زندگی اور اس کے متعلق نئے مسائل، تجربات، تاثرات اور حقائق اپنے دامن میں پوری طرح سمیٹے ہوئے ہے، اندازِ بیاں دلچسپ، سادہ رواں دواں

اور دلکش ہے ۔

صدیوں صدیوں میرا سفر منزل منزل راہ گذر
کتنا مشکل ، کتنا کٹھن جینے سے جینے کا ہنر
رات کے پیچھے رات چلے خواب ہوا ہر خواب سحر

یہ بات بھی کتنی سچی ہے کہ آج ہم "سکون" ہلچل سے حاصل کرتے ہیں اس لیے ہلچل کے بغیر چین نہیں :

ہم بھی کیا ہیں کل تک ہم کو فکر سکوں کی رہتی تھی آج سکوں سے گھبراتے ہیں چین ملے ہے ہلچل میں

یہ اشعار بھی اپنے اندر بڑی سچائیاں سمیٹے ہوئے ہیں ۔ دنیا ، دنیا کے لوگ ، اُن کی فکر کے تانے بانے بے رنگ عزائم ، بے مقصد شب و روز ، ادھوری زندگی ، تہہ بہ تہہ بے راہ رویاں کہ آدمی کا وجود بے حقیقت اور اس کا ہونا نہ ہونا معلوم ہونے لگے :

وطن سے عشق ، غریبی سے بیر ، امن سے پیار سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں
ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ رہتے ہیں کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی پڑتا ہے

ذرا اشعار کی تلخیاں بھی گوارہ کیجیے ۔ اللہ اللہ کیسی بلندی کیسی پستی دکھائی دیتی ہے اور اس کے پیچھے شاعر کی جھنجھلاہٹ اپنا کام کرتی ہوئی ملتی ہے :

یہ ٹھیک ہے کہ ستاروں پہ گھوم آئے ہم مگر کسے ہے سلیقہ زمیں پہ چلنے کا
پاؤں تحت الثریٰ میں اترتے گئے ، ذہن اڑتا رہا آسمانوں کے بیچ

تجربے کی منزل کہاں جا پہنچی ہے ، حقیقت تلخ ہے تلخ ہی ہونا چاہیے ، زمانہ بڑا ستم شعار ہے :

سوائے گرد ملامت ملا بھی کیا مجھ کو بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

اور شاعر کی یہ بات بھی غور و فکر کا تقاضا کرتی ہے :

مزاج رہبر و راہی بدل گیا ہے میاں زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے میاں
جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا ہے میاں

یا اِن اشعار کی باتیں بھی سنیے ، جاں نثار اختر زندگی کی پیچیدگیوں سے بڑی حد تک آگاہ نظر آتے ہیں اور اسے برتنے کا سلیقہ جان چکے ہیں :

جیسے جیسے زندگی پیچیدہ تر ہوتی گئی آدمی کی اور بھی بے چارگی بڑھتی گئی

زندگی یوں تو نہ باہوں میں چلی آئے گی　　غم دوراں کے ذرا ناز اٹھاؤ یارو

اور اس بات کا بھی ان کے یہاں شدت سے احساس ملتا ہے:

کوئے غم حیات میں سب عمر کاٹ دی　　تھوڑا سا وقت واں بھی گذار آئے یہ نہیں

کشادہ دلی اور وسیع النظری کے نعرے لگانا الگ بات ہے، اس پر عمل پیرا ہونا اور بات ہے۔ جاں نثار اختر کے یہ اشعار ان کی اس خصوصیت کی شہادت دیتے ہیں، اگر ہمارے ملک کے شعرا انسان دوستی کے اس جذبے کی اشاعت کریں تو یہاں کے رہنے والے بہت سی پریشانیوں اور دشواریوں سے نجات پا جائیں:

ایک ہے زمیں تو سمت کیا حدود کیا　　روشنی جہاں بھی ہو روشنی کا ساتھ دو

کیا بتوں کا واسطہ کیا خدا کا واسطہ　　آدمی کے واسطے آدمی کا ساتھ دو

ہر ایک سمت سے ایک آفتاب ابھرے گا　　چراغ دیر و حرم تو بجھا کے دیکھ ذرا

آج شہر کے زندگی میں عجیب کشمکش، بے چینی، اضطراب اور کاروباری انداز آگیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عام طور سے لوگوں کی زندگی غیر مطمئن بے مزہ ہو کر رہ گئی ہے چنانچہ اکثر شہری گاؤں کی زندگی پسند کرنے لگے ہیں جہاں انھیں سکون اور اطمینان نظر آتا ہے اور بے کیف زندگی باکیف بنتی دکھائی دیتی ہے۔ جاں نثار اختر بھی یہی محسوس کرتے ہیں:

آسودگی کی جان اگر ہے تو گاؤں میں　　شہروں کا زہر گھول نہ دینا ہواؤں میں

ہر ایک شخص پریشان و دربدر سا لگے　　یہ شہر مجھ کو تو یارو کوئی بھنور سا لگے

ان غزلوں میں نیا لہجہ، نئی آواز، نئی سمتیں، نئے گوشے، نئی آرزوئیں اور نئی منزلوں کے ساتھ نئے نئے تجربے بھی ہیں۔ جاں نثار اختر نے بعض پرانے الفاظ کو نئے لب و لہجہ کے ساتھ استعمال کر کے ایک عجیب کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یارو، لوگو، صاحبو، میاں وغیرہ ایسے ہی الفاظ ہیں، بعض متروک الفاظ کو دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں دالان، ساڑھی، گنگا، فٹ پاتھ، پیتل، برکھا، ناول، مندر، ماچس، فساد، پنڈلیوں دیوتاؤں، سنگھار وغیرہ کا برجستہ اور برمحل استعمال ملتا ہے۔ ان کے علاوہ ہندی الفاظ یگ، کتھا، اتہاس، دیپ، من بھید، مدھر راگ، لتاؤں، گھپاؤں، ڈھلواؤں

وغیرہ کو جاں نثار اختر نے اپنی غزلوں میں بڑی فنکاری سے استعمال کیے ہیں اور انھیں بے لطف بھی ہونے نہیں دیا ہے صفحہ ۲ پر درج غزل میں ہندی زبان اور مزاج کا اثر غالب ہے لیکن غزل کا کیف و سرور بھی قائم ہے اس کی بدمستی اور سرمستی کا بھی وہی عالم ہے۔ حالانکہ ہندی الفاظ کی کثرت کی وجہ سے ڈر تھا کہ غزل کے آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ لیکن جاں نثار اختر کی فنکارانہ غزل گوئی اور ہندی الفاظ اور اس کے مزاج سے آشنائی نے اس خطرے سے بچالیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے اور اس تجربہ کی داد دیجیے :

ایک تو نینا کجرارے تس پہ ڈوبے کاجل میں
بجلی کی بڑھ جائے چمک کچھ اور بھی گہرے بادل میں
آج ذرا للچائی نظر سے اس کو بس کیا دیکھ لیا،
پگ پگ اس کے دل کی دھڑکن اتری آئے پایل میں
پیا سے پیا سے نیناں اس کی جانے پگلی چاہے کیا
تٹ پر جب بھی جاوے سوچے ندیا بھر لوں چھاگل میں
کھڑکی کی باریک جھری سے کون یہ مجھ تک آجاوے
جسم چرائے نین جھکائے خوشبو باندھے آنچل میں

اس لیے انھیں اپنی غزل گوئی پر ناز ہے جس کا اظہار انھوں نے اس طرح مختلف جگہ کیا ہے :

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا ہے
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے
ہماری قدر کر و اے سخن کے متوالو
غزل کو کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم جیسے
ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دل پاسِ روایات کرے ہے

بات سچ ہے جاں نثار اختر غزل کے مزاج داں ہیں، اس کے رنگ، آہنگ اور سوز و گداز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ غزل جو ریاضت چاہتی ہے،

جیسی طبیعت چاہتی ہے جس قسم کی صلاحیت کا تقاضہ کرتی ہے جاں نثار اختر اس اس پر پورے اترتے ہیں اِسی لیے وہ نظموں سے ہٹ کر غزلوں کی دنیا میں اپنے افکار اپنے خیالات، اپنے جذبات اپنے احساسات اپنے موضوعات اپنے اسلوب اور اپنے رنگ وآہنگ کی وجہ سے نہ صرف جانے پہچانے جاتے رہیںگے بلکہ اپنا ایک منفرد مقام رکھیں گے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہو گا کہ ان کی غزلوں کا مجموعہ ”پچھلے پہر“، اردو غزل کے سرمایہ میں خوبصورت اضافہ ہے۔

[جاں نثار اختر نمبر۔فن اور شخصیت - مارچ ۱۹۷۶]

فیض کی شاعری

ایک جائزہ

فیض احمد فیض اس وقت اُردو کے تنہا بین اقوامی شہرت کے شاعر ہیں جو اپنے کلام کی کمیت کے باوجود نہایت پسند کیے جاتے ہیں اور احترام اور شہرت کی اُس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں غالب اور اقبال کے بعد فیض کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ مقبولیت اور شہرت جو انھیں آج نصیب ہے اس کی ابتدا ان کے بچپن سے کسی نہ کسی صورت میں ہو گئی تھی وہ اپنے طالب علمی کے زمانے ہی میں اسکول اور کالج میں اپنے حلقہ میں نمایاں حیثیت کے مالک ہو گئے تھے۔

اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اُن کو ابتدا سے پڑھنے لکھنے کا ماحول ملا، اچھے لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی پھر خود بھی اچھی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق لے کر آئے تھے اس لیے اس حقیقت کے باوجود جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں:

"...... ہم پڑھنے لکھنے میں ٹھیک تھے کھیل بھی لیتے تھے، لیکن پڑھائی میں ہم نے کوئی ایسا کمال پیدا نہیں کیا تھا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں"[1]

اسکول کی جماعتوں میں ہمیشہ مانیٹر کی حیثیت سے رہے، اساتذہ نے اور ساتھی طلبہ نے بھی ان کے ساتھ محبت اور شفقت برتی، زندگی کی تعمیر میں یہ باتیں کم اہم نہیں ہوتیں ہیں، پھر ابتدائی زندگی میں ایسے ماحول کا میسر آنا بھی بڑی خوش نصیبی کی بات ہوتی ہے جس کی طرف خود فیض نے مندرجہ ذیل عبارت میں اشارہ کیا ہے:

"صبح ہم اپنے ابّا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔ معمول یہ

---

[1] فیض نمبر، سہ ماہی غالب، کراچی ص ۱۴

تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اٹھ بیٹھے۔ ابّا کے ساتھ مسجد گئے، نماز ادا کی، اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے، درس قرآن سنا پھر ابّا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے سیر کے لیے گئے، پھر اسکول، رات کو ابّا بلالیا کرتے خط لکھنے کے لیے، اس زمانے میں انھیں خط لکھنے میں دقت ہوتی تھی، ہم ان کے سکریٹری کا کام انجام دیتے تھے، انھیں اخبار بھی پڑھ کر سُناتے تھے،، ؎۲

اس تحریر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فیض کی اوائل زندگی کے اوقات ترتیب و تنظیم کے ساتھ حصول تعلیم میں گزرے، ظاہر ہے اس سے انھیں بہت کچھ ملا، وہ خود بیان کرتے ہیں:

"انگریزی اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہوا،، ؎۳

سحر خیزی، عبادت، ریاضت اور مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی جیسے فاضل وقت کی صحبت نے بھی ان کی زندگی میں دبے پاؤں انقلاب لانے کی کوشش کی، علم سے دلچسپی پیدا ہوئی، غور و فکر کا جذبہ بیدار ہوا اہلِ علم کا احترام سیکھا، انسانوں سے ہمدردی کا خیال پیدا ہوا، سچائی کی تلاش ہوئی، خدمتِ خلق کے لیے طبیعت مائل ہوئی اور یہ سب اس زمانے کی باتیں ہیں جب وہ چھٹی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے اس زمانے میں انھیں پڑھنے کا شوق اس قدر بڑھا کہ اپنے مکان کے قریب ایک دکان سے دو پیسے کرایہ پر کتاب پڑھنے کے لیے لایا کرنے لگے جس نے انھیں کافی فائدہ پہنچایا، اس زمانے میں انھوں نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا تھا وہ بھی قابلِ ذکر ہیں وہ بیان کرتے ہیں:

"ہماری چھٹی، ساتویں، جماعت کی طالب علمی میں جن کتابوں کا رواج

؎۲ فیض نمبر سہ ماہی "غالب"، کراچی (اپریل جون ۱۹۷۶ء) ص ۱۵

؎۳ فیض نمبر سہ ماہی "غالب"، کراچی (اپریل جون ۱۹۷۶ء) ص ۱۵

تھا وہ آج کل قریب قریب مفقود ہو چکی ہیں طلسم ہوشربا ، فسانہ آزاد ، عبدالحلیم
شرر کے ناول وغیرہ ، یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں ، اس کے بعد شاعروں
کا کلام پڑھا ، میر کا کلام پڑھا غالب تو اس وقت بہت زیادہ ہماری سمجھ
میں نہیں آیا ، دوسروں کا کلام بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا ، لیکن ان کا دل
پر اثر کچھ اس قسم کا ہوتا تھا ، جیسے سانس رکنے لگی ہے ، اس مطالعہ کی
وجہ سے ایک خاص قسم کا لگاؤ شعر سے پیدا ہوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی"
اس طرح کرایہ کی کتابوں نے اُن میں شعر و ادب کا ذوق پیدا کر دیا ، لیکن بات
یہیں ختم نہیں ہو جاتی ، جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے والد کے خادم حافظ ولی اللہ
ڈلہوزی اسکوائر میں مولانا آزاد کے چھپ کر پڑھنے پر چڑچڑاتے تھے فیض کے والد کے
منشی ، فیض کی چھپ کر کتابیں پڑھنے کی عادت پر کڑھتے تھے ۔ انھوں نے فیض کی شکایت
ان کے والد سے کر دی ۔ لیکن اس سے فیض کو نقصان کے بجائے فائدہ ہوا ، فیض لکھتے ہیں :

"ہمارے ابا کے منشی گھر کے ایک طرح کے منیجر بھی تھے ، ہمارا ان سے کسی
بات پر اختلاف ہو گیا تو انھوں نے کہا ، اچھا آج ہم تمھاری شکایت کریں گے ،
تم ناول پڑھتے ہو ، اسکول کی کتابیں پڑھنے کے بجائے چھپ کر انٹ
شنٹ کتابیں پڑھتے ہو ، ہمیں اس سے بہت ڈر ہوا اور ہم نے اُن
کی بہت منّت کی کہ شکایت نہ کریں مگر وہ نہ مانے اور ابا سے شکایت
کر دی ۔ ابا نے ہمیں بلایا اور کہا میں نے سنا ہے تم ناول پڑھتے
ہو ۔ میں نے کہا جی ہاں ، کہنے لگے ناول ہی پڑھنا ہے تو انگریزی
ناول پڑھو اردو ناول اچھے نہیں ہوتے ۔ شہر کے قلعہ میں جو لائبریری
ہے وہاں سے ناول لا کر پڑھا کرو ۔" ؎۵

چنانچہ فیض نے ڈکنس اور ہارڈی کے ناول پڑھ ڈالے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
دسویں جماعت میں پہنچتے پہنچتے انگریزی میں کافی استعداد پیدا ہو گئی ۔ اس زمانے

؎۴ فیض نمبر ، غالب سہ ماہی کراچی (اپریل ۔ جون ۱۹۷۶ء) ص ۱۵-۱۶

؎۵ فیض نمبر ، غالب سہ ماہی کراچی (اپریل ۔ جون ۱۹۷۶ء) ص ۱۶

شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہو گئی تھی وہ ابھی دسویں جماعت ہی میں تھے کہ گھر سے ملی ہوئی حویلی کے مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔ دو ایک مشاعروں میں شعر بھی پڑھے لیکن منشی سراج دین صاحب جو عام طور سے ان مشاعروں کی صدارت کیا کرتے تھے یہ کہتے ہوئے شعر گوئی سے منع کر دیا:

"میاں ٹھیک ہے تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو۔ مگر یہ کام چھوڑ دو۔ ابھی تم تو پڑھو لکھو اور جب تمہارے دل و دماغ میں پختگی آجائے تب یہ کام کرنا۔ اس وقت یہ تضیع اوقات ہے"۔[۱]

چنانچہ فیض نے شعر کہنا ترک کر دیا لیکن جب مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ لیا، تو یوسف سلیم چشتی صاحب نے جو وہاں اردو پڑھاتے تھے طرحی مشاعروں کی بنا ڈالی، انھیں کے کہنے پر فیض نے شعر کہے تو چشتی صاحب نے ہمت افزائی کی اور کہا:

"اس طرف توجہ کرو شاید تم کسی دن شاعر بن جاؤ"۔[۲]

سیالکوٹ کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں جب فیض نے داخلہ لیا، تو پطرس بخاری، ڈاکٹر تاثیر اور صوفی تبسم جیسے اساتذہ سے تعلق پیدا ہوا پھر لاہور کے ادیبوں میں امتیاز علی تاج، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور سیکھنے کا موقع ملا، جب ام۔اے میں پہنچے تو فیض نے شعر و شاعری سے خاص دلچسپی لینی شروع کر دی، یہ تعلیمی دور ۱۹۳۴ء تک رہا، اس وقت تک وہ عربی اور انگریزی میں ام۔اے کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔

ابتدائی دور کی شاعری کا یہ زمانہ کالج کی تعلیم کے دور تک پھیلا ہوا ہے اس زمانے میں شعر و شاعری سے فیض کی دلچسپی ضرور تھی لیکن انھیں اس کا خیال کبھی نہیں آیا کہ وہ مستقبل میں شاعر بنیں گے۔ ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں ۱۹۳۵ء میں

---

[۱] فیض نمبر۔ غالب سہ ماہی کراچی اپریل۔ جون ۷۸ ۱۹ء ص ۱۷

[۲] " " ص ۱۷

لکچرر مقرر ہوئے تو پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ شعر کہنا شروع کیا، اس زمانے میں سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی جس کی وجہ محمود الظفر، رشید جہاں اور ڈاکٹر تاثیر تھے۔ مزدوروں میں کام کرنے کا موقع ملا ترقی پسند تحریک سے قریب ہوئے اور اس کی تنظیم میں حصہ لیا۔ جس سے ذہنی طور پر انھیں سکون حاصل ہوا۔

فیض احمد فیض کی زندگی کے اس ابتدائی، تعلیمی و تربیتی پس منظر کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ پیدائشی شاعر ہیں۔ انھوں نے نہایت کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا لیکن صحیح معنوں میں کالج کی زندگی میں شاعری سے عہد و پیمان باندھا اور پھر جو یہ سلسلہ جاری ہوا تو آج تک ان کی شاعری نہ صرف قائم ہے بلکہ اپنی ایک آواز اپنی ایک پہچان اور اپنا ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ حالات نے شاعری کی رفتار کو کبھی تیز کر دیا، کبھی سست بنا دیا۔ اس دور میں انھوں نے جتنا کچھ کہا وہ کلام حسب ذیل چھ شعری مجموعوں میں محفوظ ہے:

(۱) نقش فریادی ۱۹۴۱ء (۲) دست صبا ۱۹۵۲ء
(۳) زنداں نامہ ۱۹۵۶ء (۴) دست تہہ سنگ ۱۹۶۵ء
(۵) سروادی سینا ۱۹۷۱ء (۶) شام شہر یاراں ۱۹۷۸ء

ان میں نظموں کی تعداد اس طرح ہے:

نقش فریادی۔ ۳۱ دست صبا۔ ۲۱ زنداں نامہ ۱۱
دست تہہ سنگ۔ ۱۵ سروادی سینا۔ ۳۰ شام شہر یاراں ۲۰
= ۱۲۸ نظمیں

غزلوں کی تعداد یہ ہے

نقش فریادی۔ ۱۲ دست صبا۔ ۱۷ زنداں نامہ ۱۵
دست تہہ سنگ۔ ۱۱، سروادی سینا۔ ۷ شام شہر یاراں ۱۰
= ۷۲

قطعات حسب ذیل ہیں:

نقش فریادی۔ ۴ دست صبا۔ ۸ زنداں نامہ ــ ۷
دست تہہ سنگ ــ ۷ سروادی سینا۔ ۶ شام شہر یاراں ــ ۱
= ۳۳

منظوم تراجم یہ ہیں:

نقشِ فریادی - ۱ سرِ وادیِ سینا - ۹ شامِ شہرِ یاراں ۴

= ۱۴

ان کے علاوہ:

مرثیہ	شامِ شہرِ یاراں			۱	
اشعار	″	″	″	۲	
مدح	″	″	″	۱	
گیت	″	″	″	۴	
پنجابی تخلیقات	″	″	″	۵	= ۱۳

یہ چھ مختصر شعری مجموعے جن میں نظموں، غزلوں، قطعوں اور دوسری اصناف کی مجموعی تعداد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے سے ۱۹۷۸ء تک ایک طویل مدت کے مقابلے میں ان کا کلام کتنا مختصر ہے لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ اس مختصر کلام کے باوجود اردو کے بڑے شعرا کی صف میں کھڑے ہونے میں بہت جلد کامیاب ہو گئے ہیں، ویسے ان کی شاعری کے ابتدائی زمانے ہی سے انھیں مقبولیت حاصل ہونی شروع ہو گئی تھی چنانچہ ان کا پہلا شعری مجموعہ نقش فریادی جب پہلی بار ۱۹۴۱ء میں چھپا تو ان کی شہرت اور مقبولیت نے نہایت تیزی کے ساتھ اس مجموعہ کلام کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اردو دنیا میں پھیلا دیا۔

ان کی شہرت کے سلسلے میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس میں ترقی پسند تحریک کو بھی بڑا دخل ہے اس لیے کہ ادھر وہ طالب علمی کے حصار سے نکل کر ملازمت (۱۹۳۵ء) کی حدود میں داخل ہو رہے تھے، اُدھر ترقی پسند تحریک کی ہندستان میں بنیادیں پڑ رہی تھیں۔ فیض اس تحریک سے شروع ہی سے وابستہ ہو گئے۔ ظاہر ہے اس زمانے میں اس تحریک سے جو شعرا اور ادبا وابستہ ہوئے وہ بہت کم مدت میں غیر منقسم ہندستان کے ادبی حلقوں میں پہچانے جانے لگے۔ اس تحریک کی وجہہ سے شعراء محض اپنی گھن گرج آواز، اور ہنگامی شاعری کے بل پر نمایاں شعرا کے صف میں آ کھڑے ہوئے تھے لیکن رفتہ رفتہ جیسے جیسے اس تحریک کی گرفت

ڈھیلی ہوتی گئی ان شعراء کی آواز بھی مدھم پڑتی گئی ــ کلام بھی بے مزہ اور بے اثر ثابت ہونے لگا۔

لیکن فیض کے ساتھ بات کچھ اور ہوئی۔ تحریک سے ان کی وابستگی صرف سیاسی شعور کی وجہہ سے نہیں تھی بلکہ انسانیت سے ہمدردی اور محبت کی وجہہ سے بھی تھی۔ اس وجہہ سے وہ کوئی نعرہ لگاتے ہوئے اس تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے تھے نہ کسی فلسفہ حیات کے سہارے شاعری کی حدود میں داخل ہوئے تھے۔

"نقش فریادی"، فیض کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں طالب علمی کے زمانے سے ۱۹۴۱ء تک کا کلام محفوظ ہے اس مجموعہ کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس میں درج نظمیں کب کب کہی گئی ہیں۔ ابتدا کی خبر نہ انتہا معلوم" اس کی سال اشاعت سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس مجموعہ میں شامل نظمیں ۱۹۴۱ء یا اس سے قبل تک کی ہیں البتہ دیباچہ پڑھنے سے اس کا علم ہوتا ہے کہ :

"اس مجموعے میں نظموں کی ترتیب کم وبیش وہی ہے جس میں لکھی گئی ہیں۔ پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانے کی نظمیں ہیں"

طالب علمی کے زمانے کی نظمیں حذف نہ کرنے کی فیض وجہہ یہ بتاتے ہیں:

"ان نظموں میں جس کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ اپنی سطحیت کے باوجود عالمگیر ہے ایک خاص عمر میں ہر کوئی یہی کچھ محسوس کرتا ہے اور اسی انداز سے سوچتا ہے لیکن عام طور پر ان تجربات کا خلوص تمام عمر قائم نہیں رہتا"

فیض کا اشارہ اپنی رومانی نظموں کی طرف ہے اور "نقش فریادی"، میں ایسی شاعری کی زیادتی کے زمانے کا تعین اُن کی نظم "میرے ندیم"، تک کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے دور کے بارے میں فیض لکھتے ہیں:

"کچھ عرصہ کے بعد انسان اپنی ذات کو مرکز دو عالم سمجھنا چھوڑ دیتا ہے اور اسے وہ عالمگیر ظلم اور بے انصافی کے پیشِ نظر اپنی ذرا ذرا سی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔"

فیض کے یہاں ایسی شاعری کا دور "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" سے شروع ہوتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ان نظموں کے ساتھ تاریخ اگر درج ہوتی تو فیض کے ذہنی رویئے کی اس تبدیلی کی تاریخ متعین کرنے میں آسانی ہوتی۔

پورے مجموعے میں فیض نے نہایت سادگی اور سچائی کے ساتھ "نقش فریادی" کے "دیباچہ" میں یہ فیصلہ سنا کر بڑی جرأت سے کام لیا ہے کہ:

"اس مجموعے کی اشاعت ایک طرح کا اعتراف شکست ہے شاید یہی دو چار نظمیں قابل برداشت ہوں"

اور اس میں شک نہیں کہ فیض کا یہ خیال اپنے کلام کے بارے میں بہت حد تک درست ہے کہ فیض جیسے شاعر سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے۔ پھر بھی اُن کے مجموعۂ کلام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ غور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس کے وجوہ یہ ہیں۔ وہ بڑا مانوس لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی زبان نہایت سادہ شیریں اور عام فہم ہوتی ہے، اُن کے کلام میں مشکل ہی سے کوئی نامانوس لفظ ملے گا، اُن کی ساری شاعری میں اپنائیت کی فضا ہے۔ انداز بیان میں دلکشی پائی جاتی ہے۔ زبان میں لوچ اور نرمی سے ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے پھر خلوص کی ہر جگہ کار فرمائی نظر آتی ہے، اُن کے اس طرح کے کلام میں کہیں بھی نشتریت نہیں ہے، نہ تلخی ہے نہ جھنجھلاہٹ ہے نہ غیظ و غضب ہے، نہ نفرت اور حقارت کے جذبے کا اظہار ہے بلکہ ان میں ایک خاص قسم کی دردمندی، غم ناکی، دبی دبی رنج کی کیفیت، تڑپ اور بے چینی ہے، اُن کا غم اُن کی شاعری میں ایسا گھل مل گیا ہے کہ ان کی شاعری مجسم سوز و گداز بن گئی ہے، پڑھتے جائیے اُن کا غم آپ کے دل میں اترتا جائیگا اور تھوڑی دیر کے بعد آپ اسے اپنا محسوس کرنے لگیں گے۔ اُن کی شاعری سے تیار کی ہوئی فضا آپ کی اپنی دنیا میں اپنا ماحول نظر آئیگا۔ فیض تو اپنا کلام ختم کر کے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن قاری کے دل میں نہایت میٹھا میٹھا درد چھوڑ جاتے ہیں وہ بہت دیر تک اس فضا سے اپنے آپ کو نکال نہیں سکتا اور اس دور سے آزاد نہیں رہ سکتا یا اس سرشاری سے بے تعلقی پیدا نہیں کر سکتا۔

پھر فیض کی شاعری کی ابتدا رومانی شاعری سے ہوئی ہے۔ حسن وعشق کی شاعری، جذبات کی شاعری، لگاؤ کی شاعری، سرمستی کی شاعری ایسی شاعری ہوتی ہے جو نوجوانوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے اور دل ودماغ پر دیر تک کے لیے حاوی ہو جاتی ہے۔ اُن کے پڑھنے سے نوجوانوں کی سرشاریوں میں اضافہ ہوتا ہے انھیں سرمستی اور بدمستی کا لطف آتا ہے یہ خوبیاں فیض کی شاعری میں ابتدا سے ہیں۔ انھوں نے اس میں غزل کے سوز وگداز سے کام لیا ہے جس نے ان کے عشقیہ کلام کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ لیکن ان کے عشقیہ کلام کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے نوجوانوں کے سستے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اس نے کسی قسم کی بے راہروی اختیار کرنے کے لیے اکسایا نہیں، آہ و نالہ کرنے پر مجبور نہیں کیا ہے، سسکیاں بھرنے کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ ان کے مطالعہ سے ایک خاص قسم کے شریفانہ جذبات مچلنے لگتے ہیں، ایک خاص قسم کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے ہلکی سی کسک، میٹھا، میٹھا درد، پرلطف تڑپ اور محبوب کی چاہت میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے لیکن عام اور سطحی وصل کی تمنا سر نہیں اٹھاتی اور نہ کسی قسم کا اضطراب پیدا کرتی ہے بلکہ اُن میں انسانی جذبے کی ایسی فضا ملتی ہے جن میں ایک خاص قسم کا تقدس نظر آتا ہے۔

عشق کے یہ واردات اور کیفیات کس قدر پاکیزہ ہیں ملاحظہ کیجیے:

چھپ کر کبھی رونا راتوں کی خموشی میں
ملبوس کو دھو لینا مجبور جوانی کے
جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
سینوں سے لگا لینا بھولی ہوئی یادوں کو
(انتہائے کار)

تمھارے ستم اور میری وفائیں تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمھیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں (انجام)

دل میں بیتاب ہے صدائے حیات آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسمان پر اُداس ہیں تارے چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زر نگار کر لیں ہم
(سرودِ شبانہ)

ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی نگاہیں بجھ رہی ہیں راستہ زر کار ہے اب بھی
مگر جانِ حزیں صدمے سہے گی آخرش کبتک ؟ تیری بے مہریوں پہ جان دے گی آخرش کبتک
(میری جاں اب بھی اپنا حسن)

انتظار[1] کا اضطراب بھی عجب تاثر چھوڑتا ہے اور اس کا بھی احساس دلاتا ہے کہ راہِ عشق کا مسافر تھک چلا ہے:

قسم تمھاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٰ صبر و شکیب آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بیتاب تھک گیا ہوں میں
(انتظار)

محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہوئے اسے ملاقات کے لیے آمادہ کرنا چاہتا ہے تو اسلوب کس قدر سادہ مگر پُرکشش اختیار کرتا ہے:

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے

---

[1] فیض کی شاعری میں "انتظار" اور تنہائی کا احساس بار بار شدت سے ہوتا ہے وہ یا تو تنہا خود کلامی میں مبتلا یا سرگوشی کرتے محسوس ہوتے ہیں یا انتظار میں مصروف، ان کی نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی کئی شعر اس طرف اشارہ کرتے ہیں:

تو ہے اور اک تغافلِ پیہم میں ہوں اور انتظارِ بے انداز
عشق منت کشِ قرار نہیں حسن مجبورِ انتظار نہیں
چارۂ انتظار کون کرے تیری نفرت بھی استوار نہیں
لطف کا انتظار کرتا ہوں جور تا حدِ ناز ہو جائے
کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب

آ کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم

آ محبت کے گیت گا لیں ہم (سرودِ شبانہ)

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے کہہ کر شاعر نے محبوب کو عارضی زندگی اور عارضی حسن کا احساس دلایا ہے اس سے اس کے ملنے کی آرزو جوڑ دی ہے تاکہ اس کے دل میں ملاقات کی خواہش پیدا ہو جائے۔

محبوب سے ملنے کی آرزو شاعر کو بار بار بے چین کرتی ہے اور وہ ہمیشہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ کسی طرح کبھی ملاقات ہو جائے لیکن یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوئی، بس شاعر کے دل میں ہمیشہ مچلتی رہی، وہ سوگوار بھی نظر آتا ہے تھکا ہارا بھی یہاں تک کہ آخری خط میں اس حقیقت سے بھی اپنے محبوب کو آگاہ کر دیتا ہے:

وہ وقت میری جان بہت دور نہیں ہے

جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں

اور حد سے گزر جائے گا اندوہِ نہانی

تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں

چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں

چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی (آخری خط)

ان تمام نظموں کے اقتباسات سے شاعر کے عاشقانہ جذبات کا پتہ چلتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ سنجیدہ بھی ہے اور جذبات پر قابو بھی رکھتا ہے۔ غم سے نڈھال ہونے کے باوجود اسے اظہار کے بجائے پی جانے کا عادی ہے۔ وہ محبوب کے لیے بے چین ہوتا ہے اس سے ملنا چاہتا ہے اس کے ساتھ شب و روز گذارنے کی خواہش رکھتا ہے لیکن اس کے لیے کسی قسم کی بے راہ روی اختیار کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ سارا غم خود ہی جھیلتا رہتا ہے اور اس کے بعد بھی اسے اس کا انتظار رہتا ہے ـــ اسے مایوسی کبھی نہیں ہوتی وہ سمجھتا ہے کہ اس کا محبوب کبھی نہ کبھی اپنی بے توجہی پر نادم ہو گا۔ اپنی نظم

"آخری خط" میں وہ اپنے آپ کو یہ سوچ کر اس طرح تسکین دیتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے محبوب کو شرمندگی ہوگی اور وہ آئے گا:

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی — اپنے دلِ معصوم کو ناشاد کرو گی!
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے — نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

لیکن اس کے دل میں اس طرح کا شبہ بھی پیدا ہوتا ہے:

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی — شاید مری بے سود وفاؤں پہ ہنسو گی
اس وضعِ کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہوگا — لیکن دلِ ناکام کو احساس نہ ہوگا

دونوں حالت میں عاشق اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوگا:

القصہ مآلِ غمِ الفت پہ ہنسو تم! — یا اشک بہاتی رہو فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت — خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ الفت

یہاں سے وہاں تک جذبات میں بڑا ٹھہراؤ ہے، خیالات میں پاکیزگی ہے، اظہار میں سنجیدگی ہے، اسلوب میں سادگی ہے۔ آہنگ میں شام کے وقت آہستہ آہستہ بہتی ہوئی ندی کا اداس نغمہ ہے۔ ہلکا ہلکا کرب محسوس ہوتا ہے اور ان کے مطالعے کے بعد مغموم فضا میں ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں، اداس ماحول میں دیکھتے ہیں کہیں کبھی کسی قسم کی شوخی نہیں جھلکتی، کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نظر نہیں آتی، کہیں بھی لپک جھپک نہیں دکھائی دیتی، کہیں جذبات بے لگام نہیں نظر آتے، رکاکت کا اظہار ہے دور دور پتا نہیں ہے پھر وہ حسن جس کے پیچھے عشق اپنے آپکو نہایت خاموشی کے ساتھ مٹاتا جا رہا ہے فیض اس کی تصویریں کس کس طرح سے پیش کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں

یا

چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بنِ مو سے
رواں ہو برگِ گل تر سے، جیسے نسیم
ضیائے مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نسیم

دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے
اُداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں
دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں (تہہ نجوم)

یا

شوخیاں مضطر، نگاہِ دیدۂ سرشار ہیں
عشرتیں خوابیدہ رنگِ غازۂ رخسار ہیں
سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مے گلنار میں (تصور۔ تین منظر)

یا

فسردہ رُخ، لبوں پر اک نیاز آمیز خاموشی
تبسم مضمحل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بے کسی تھی تیری پُر تمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں (رخصت۔ تین منظر)

یا

ہزار فتنے تہِ پائے ناز، خاک نشیں ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں
شباب، جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
وقار جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں
ادائے لغزشِ پا پہ قیامتیں قرباں،
بیاضِ رخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں،
سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم
وہ آنکھ جس کی بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہار لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش
گداز جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سرو سہی نماز کرے
غرض وہ حسن جو محتاجِ وصف و ناز نہیں
وہ حسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں (ایک رہگذر پر)

لیکن یہاں ایک بات کھٹکتی ہے ان کا محبوب بھی وہی بے مثال حسن کا مالک ہے:

وہ حسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں

گویا وہی کتابی اور انسانی ذہن کا تراشیدہ حسن ہے جس کا متلاشی ہمارے شعرا کا کارواں صدیوں سے رہا ہے وہ محض خیال میں پایا جاتا ہے، مادّی صورت میں نہیں، یہ حسن غزل کی دنیا میں ملتا ہے، رومانی شاعری میں ملتا ہے جو حسن وجمال کا پیکر، پری چہرہ، حور وش ہوتا ہے۔ یہاں ترقی پسند شاعر فیض سے کسی قدر مایوسی ہوتی ہے۔ انھوں نے روایت سے ہٹ کر محبوب کی پیکر تراشی کی کوشش نہیں کی، وہ جس دور کے شاعر تھے، جس دور کے پروردہ تھے، جس ماحول میں سانس لے رہے تھے اسی میں ان کا محبوب سانس لے رہا ہوگا، انسانی حسن وجمال سے آراستہ ہوگا اس کے اپنے احساسات ہوں گے، جذبات بھی ہوں گے۔ اس کے اپنے انداز اور اپنی ادائیں بھی ہوں گی، اس میں بہت کچھ خوبیاں ہونگی کچھ ایسی باتیں بھی ہوں گی جو مہتاب میں داغ بن کر اس کے حسن میں اور زیادہ اضافہ کر دیں، یقیناً ان کی یہ شاعری عہدِ شباب کی شاعری ہے۔ جس میں شراب کی مستی بھی ہوتی ہے۔ اور طوفان کا جوش و خروش بھی، ظاہر ہے عمر کی اس منزل میں اچھی صورت تو اچھی لگتی ہی ہے لیکن بُری بھی اچھی لگنے لگتی ہے۔ یہ سب جذبات کی باتیں ہوتی ہیں۔ فیض کی شاعری اس بات کی گواہ ہے کہ جذبات کی دنیا میں رہ کر بھی جذبات کے بہاؤ میں بہے نہیں ہیں۔ جگہ جگہ ان کے شعور نے، ان کی سنجیدگی نے، ان کے علم و حکمت نے جذبات کو لگام دیا ہے ۔ اس لیے

وہ اگر محبوب کو انسانی حُسن میں جلوہ گر دیکھتے تو ان کی شاعری اپنا اثر کچھ اور دکھاتی ۔ ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں ان کی عشقیہ شاعری کا "حُسن" خاموش ہے ، جذبات سے تقریباً عاری ، بے حس و حرکت ہے (شاید اسے اپنے حُسن کا احساس ہے اور عشق کی وارفتگی کا علم ہے) اس لیے سارا اضطراب عشق سے وابستہ ہے وہ پریشان ہوتا ہے التجا کرتا ہے ، مضطرب ہوتا ہے ، مضمحل ہوتا ہے ، مایوس ہوتا ہے لیکن اس کا بار بار "انتظار" کرتا ہے تنہائی کی راتیں گزارتا ہے اور تنہائی کے دن کاٹتا ہے اسی حسن و عشق کی وارفتگی کے عالم میں نہ جانے وہ کونسی گھڑی آتی ہے کہ شاعر کی نگاہ گاہے گا ہے محبوب کے چہرے سے ہٹ کر اپنے ارد گرد کی دنیا پر پڑنے لگتی ہے ۔ جہاں نظر سہمی انسانیت ، پریشان حال لوگ ، فکروں میں گرفتار ، غمِ زمانہ میں الجھے ہوئے ، تھکی ہاری زندگی گزارنے پر مجبور ، انسانوں پر پڑتی ہے اور وہ انسان کی اس بے بسی کو محسوس کرنے لگتا ہے ۔ "نقش فریادی" کی نظم "سرود" میں شاعر کے اس قسم کے جذبات کا احساس ہوتا ہے :

موت اپنی ، نہ عمل اپنا نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا
ناخدا دور ، ہوا تیز ، قریں کام نہنگ
وقت ہے لہروں پہ پھینک دے سفینہ اپنا
عرصہ دہر کے ہنگامے تہہ خاک سہی
گرم رکھو آتشِ پیکار سے سینہ اپنا
ساقیا رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا (سرود)

رومان سے حقیقت کی طرف آنے میں یہ شاعر کا شاید پہلا قدم ہے اس نظم کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہایت دبے پاؤں دنیائے آب و گل کی طرف رجوع ہو رہے ہیں ۔

"نقش فریادی" کے پہلے حصے کی آخری نظم "میرے ندیم" میں شاعر ایک

سوالیہ نشان بن گیا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ اگلی محبت کی وہ آرزوئیں جن میں شاعر کھویا سا رہتا تھا، جن کی وجہ سے مہ و انجم چمک اٹھے تھے، جنونِ عشق کی ہمت میں جو اک آگئی تھی یا ناصبور نگاہیں، منتظر راہیں، دل میں دبی ہوئی آہیں طویل و تیرہ و تار انتظار کی راتیں، مخملیں باہیں اور نیم خواب شبستان کی کہانیاں کھو گئی ہیں۔

اور آخر میں اگلی محبت کی یاد اس طرح آتی ہے کہ رگِ زندگی میں خونِ بہار مچلنے لگتا ہے، پرانے غموں سے روح کے تار تھرتھرانے لگتے ہیں اور پھر شاعر یہ کہتے ہوئے کہ اگلی محبتوں کے مزار منتظر ہیں چلو، چل کر چراغاں کریں نظم کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔

پوری نظم میں اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ شاعر کسی وجہ سے وادیٔ حسن و عشق سے دور ہو گیا ہے لیکن اس کا احساس کہیں سے نہیں ہوتا کہ وہ کون سی طاقت ہے جس نے اسے حُسن کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے جمیل جالبی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ:

"میرے ندیم رومانی دور کی آخری نظم میں فیض کے تیور بدلتے جا رہے ہیں اور اس کے خیالات نئے سانچوں میں اور انداز بیان میں بدلتے معلوم ہوتے ہیں جو دوسرے دور کی شاعری میں نمایاں ہو گئے ہیں"[ے]

اگر "نقش فریادی" کی نظمیں تاریخی اعتبار سے سلسلہ وار ہیں، تو یہ بات صحیح ہے کہ یہاں سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ محبت کا جادو اپنا اثر کھو رہا ہے، صرف اس دور کی یاد باقی رہ گئی ہے جو شاعر کو تھوڑی دیر کے لیے بے چین کر دیتی ہے، ایسا کیوں ہوا ہے کون سے حادثات اور واقعات اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں اس کی طرف کسی طرح کا ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔

دوسرے حصے میں پہلی مشہور نظم ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" رومان سے حقیقت کی دنیا میں پہنچنے کا "اعلان" کی حیثیت اس نظم کی ہے۔ جس نے ان کی شاعری میں انقلاب کی طرف اشارہ کیا ہے اور نئی سمتوں کا نظارہ کرایا

ے جمیل جالبی: فیض ایک مطالعہ: فیض نمبر۔ افکار کراچی ص ۳۸۶

ہے ۔ اس نظم میں نہایت سنجیدگی سے اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے ؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے ؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے ۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس نکلی، غمِ جاناں کے ذریعہ غمِ دوراں سے نجات نہیں مل سکتی، حقیقت کی دنیا کچھ اور ہے اس کے تقاضے کچھ اور ہیں، چنانچہ وہ اس نتیجے پر بہت جلد پہنچ جاتا ہے کہ :

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

دراصل مادی دنیا کی وہ حقیقتیں جو انھیں بے چین اور مضطرب کر دیتی ہیں وہ یہ ہیں :

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے

یہیں سے فیض کی شاعری ایک نئے مزاج سے آشنا ہوتی ہے ۔ فیض حسن و عشق کی حدود سے نکل کر عالمِ رنگ و بو کے غم میں مبتلا نظر آتا ہے لیکن محبوب کی یاد سے بے نیاز نہیں ہو جاتا وہ کہتا ہے :

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے

"کیا کیجیے" شاعر کی مجبوری کی طرف اشارہ کرتا ہے ورنہ وہ حسن کا قدرداں ہے۔

اس اہم نظم کے بعد جس نے شاعر کی ذہنی رو کی حدود قائم کرنے میں مدد کی ہے۔ ایک اہم نظم "سوچ" نظر سے گذرتی ہے۔ رومان سے گریز کرتے ہوئے اور حقیقت سے آشنا ہوتے ہوئے نہایت سادہ زبان رکھتی ہے اور چھوٹی بحریں ہے اس کی اِن خوبیوں نے اُسے پُرتاثیر بنا دیا ہے اس نظم میں شاعر اس وقت جن خیالات سے دوچار تھا اُن کی جھلک واضح طور سے اِن مصرعوں اور شعروں سے ملتی ہے:

چھوڑ میری رام کہانی میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

میرا دل غمگین ہے تو کیا غمگین یہ دنیا ہے ساری

تو گر میری بھی ہو جائے دنیا کے غم یونہی رہنگے

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں بعد میں سب تدبیریں سوچیں

اور اسی "سوچ" کے درمیان اُن کا ذہن ایک نئی سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو خالص سیاسی اور معاشی شعور کا پتا دیتی ہے:

بے فکرے دھن دولت والے یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

یہ پہلی مثال ہے جہاں ہم محسوس کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہمارے شاعر کے یہاں جذبہ بیدار ہونے لگا ہے اور وہ چاہنے لگا ہے کہ سرمایہ داروں کا سکھ سارے انسانوں میں تقسیم کر دیا جائے وہ سرمایہ داری کے خلاف اس جنگ کے نتائج سے بھی آگاہ ہے اور خوشی سے اُس کے حصول کے لیے قربانی دینے کے لیے تیار نظر آتا ہے:

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائینگے ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا

یہ ان کی شاعری میں نئی آواز سنائی دیتی ہے جو نئی سمت کا پتا دیتی ہے اور جو ان کی عملی سیاست کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن یہ آواز نہ تو کرخت ہے نہ

گھن گرج کا شور رکھتی ہے اور نہ ہی بار بار سنائی دیتی ہے۔

"رقیب سے" بھی اپنے طرز کی انوکھی نظم ہے، فیض نے اردو شاعری کے اس رقیب کو جسے روسیاہ کہا جاتا رہا ہے اور نہ جانے کن کن دوسرے ناموں اور کن کن صفات سے یاد کیا جاتا رہا ہے اور جو عاشق کی لعن طعن کا ہمیشہ نشانہ بنتا رہا ہے ایک خاص زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُردو شاعری میں رقیب سے متعلق اس طرح کے خیالات نئے ہیں تو بجا ہے وہ رقیب سے مخاطب ہو کر اور اسے ذریعہ بنا کر محبوب کی یاد تازہ کرتے ہیں حالانکہ آج تک حسن و عشق کے درمیان رقیب کا ذکر چاہنے والوں نے نہ صرف پسند ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس کے خلاف نفرت کا یہ بانگ دہل اعلان کیا ہے:

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے
ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

اور اس شعر میں شاعر نے رقیب کی اہمیت کہاں پہنچا دی ہے ملاحظہ کیجیے:

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

یہاں سے شاعر اک نیا رخ اختیار کرتا ہے، عشق سے جو کچھ بھی وہ حاصل کر سکا ہے اسے وہ بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہیں سے وہ غم جاناں سے غمِ دوراں کی طرف مڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ فیض کی طرح آج تک کسی نے ان پہلوؤں کی طرف سوچنے کی کوشش نہیں کی ہے:

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرماں کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستی کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رخِ زرد کے معنی سیکھے

یہاں تک تو اُن کی شاعری ساحری کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے، لیکن نہ جانے کیوں اُدھر ان کے تیور بدل جاتے ہیں اِدھر اُن کی شاعری ساحری نہیں رہتی

کچھ اور بن جاتی ہے، پھیکی، بے مزہ، بے اثر:

نا تو انوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب! بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لیے فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لیے کہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ اپنے دل پہ مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

"تنہائی" کا شمار فیض کی مشہور نظموں میں ہوتا ہے یہ نو مصرعوں پر مشتمل مختصر نظم ہے جس میں محبوب کا نہایت بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہے ہر آہٹ پر اس کی آمد کا گمان گزرتا ہے لیکن جلد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس نظم کی ابتدا شک و شبہہ کی ملی جلی فضا میں اس طرح ہوتی ہے:

پھر کوئی آیا، دلِ زار! نہیں کوئی نہیں راہ رو ہوگا، کہیں اور چلا جائیگا

اور انتہائی مایوسی پر پہنچ کر دم توڑتی ہے:

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئیگا

یہ مختصر نظم نہ مبہم ہے نہ بے معنی اور نہ اس میں "محبوب اور عہد نو" کے گھل ملنے کا سوال پیدا ہوتا ہے اس میں داخلی اور انفرادی واردات قلب کے سوا کچھ نہیں ہے جو اسے منفرد مقام دلاتی ہے۔ یہ نظم اردو میں اپنی نوعیت کی آپ مثال ہے۔

"چند روز اور مری جان" میں اگرچہ محبوب سے خطاب کیا گیا ہے لیکن یہ خالص سیاسی نظم ہے جس میں شاعر کو یقین ہے کہ ظلم کا زمانہ چند روزہ ہے جلد ہی اس سے نجات ملے گی

"چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پر مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث سے معذور ہیں ہم

اسے احساس ہے کہ اگرچہ جسم پر قید، جذبات پر زنجیریں، فکر محبوس اور گفتار پر تعزیریں ہیں، پھر بھی ہم جی رہے ہیں اور ہماری زندگی مفلس کی قبا کی مانند ہے جس پر درد کے پیوند لگے ہوئے ہیں۔

لیکن نہایت یقین اور اعتماد کے ساتھ وہ کہتا ہے:

آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم

غلامی کے اثرات سے جس قدر اس کا محبوب متاثر ہوا ہے آخری حصے میں اس کا بھی ذکر ہے جس میں اسے یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسے بھی چند ہی روز اس پریشانی کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ اس طرح یہ نظم رومان اور سیاست کے امتزاج سے دل آویز بن گئی ہے۔

"کتے"، فیض کی مشہور لیکن مختصر نظم ہے جس میں کتے کی جبلت اور فطرت پر نہایت اچھی روشنی ڈالی گئی ہے اُن کے بارے میں نہایت سادہ زبان میں بتایا گیا ہے کہ وہ گدائی کا خوگر، زمانے کی پھٹکار اور دھتکار سمیٹے ہوئے گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہتا ہے اس کی حالت یہ ہے کہ:

نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے

جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو!

یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے

ایسے حقیر اور پست فطرت جانور کو بھی جب احساس ذلت ہوتا ہے تو:

یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائیں تو انسان سب سرکشی بھول جائیں

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں

کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

یہ نظم اپنے اُسلوب کی سادگی کے ساتھ موضوع میں ندرت اور مقصد میں بڑی انفرادیت رکھتی ہے۔ بات تو کتوں کی کی گئی ہے لیکن ہندستانیوں کو ذلت کا احساس دلانے کی کوشش کی گئی ہے جو انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے سے قاصر تھے اور انتہائی بے چارگی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے، یہ نظم ہر اعتبار سے اُردو میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

"بول"، بھی ایک مختصر نظم ہے، جو خالص سیاسی ہے جس میں شاعر نے ہندستانیوں کے ضمیر کو سچ بولنے کے لیے للکارا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ انگریزوں کے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے جھنجھوڑا ہے زبان اور اسلوب سادہ اور عام فہم ہیں۔

"موضوعِ سخن" بھی فیض کی اچھی نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ نظم کی ابتدا نہایت حسین اور رومان پرور فضا میں ہوتی ہے:

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں سے سنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات
اُن کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگین
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

اور پھر حسن دلآرا کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے:

آج پھر حسن دلآرا کی وہی دھج ہوگی!
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

پھر شاعر عالمِ خیال سے عالمِ افکار کی طرف رُخ کرتا ہے اور صدیوں سے آدم و حوا پر جو کچھ گزر رہی ہے انھیں سوچ کر تڑپ اٹھتا ہے، شاعر کی نگاہیں شہر پر پڑتی ہیں، کھیتوں کی طرف جاتی اور وہ بول اُٹھتا ہے:

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق — کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسین کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا — کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

پھر شاعر افکار کی دنیا کے مختلف قسم کے مصائب پر روشنی ڈالتے ہوئے نہایت آہستہ سے دنیائے حسن و عشق میں پہنچ جاتا ہے اور محبوب کے خیال میں کھو جاتا ہے اور پھر یوں گویا ہوتا ہے:

لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط!

آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہونگے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

پوری نظم رومان اور حقیقت دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ شاعر کبھی دنیاوی آلام میں مبتلا انسانوں کا حال دیکھ کر مضطرب ہو جاتا ہے اور دنیائے حسن و عشق میں داخل ہو کر پناہ ڈھونڈھتا ہے لیکن اسے کسی حال میں چین نصیب نہیں ہوتا۔

"سیاسی لیڈر کے نام" کا شمار فیض کی اچھی نظموں میں ہوتا ہے جس میں غلام ہندستان کے سیاسی لیڈروں کی بے بسی اور بے کسی کو اس مثال سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پر یلغار کرے

ان تشبیہات سے ہندستانی لیڈروں کی حالت جیسی تھی اس کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے "اے دل بے تاب ٹھہر" میں ناموافق حالات کے باوجود شاعر نہایت پر اُمید ہے اسی لیے وہ کہتا ہے:

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر

یا

اپنے دیوانے کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گراں بارئ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

"میرے ہمدم میرے دوست" میں شاعر مادی دنیا سے لوٹ کر پھر دل کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور محبوب کی خوشی کے لیے بہت کچھ کر گذرنے کا یقین

دلاتا ہے۔

"نقش فریادی" کی آخری نظم "ترانہ" ہے جو نہایت ولولہ انگیز اور شاعر کے اس یقین سے مالا مال ہے کہ اس کی کوششیں بارآور ہوں گی۔ یہ نظم نہایت رواں دواں نغمہ سے بھرپور اور پُر اثر ہے۔ شاعر کی یقین کی کیفیت ملاحظہ کیجیے:

اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائینگے

یا

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

"نقش فریادی" کے مطالعہ سے اس بات کا صاف پتا چلتا ہے کہ فیض کی شاعری غم جاناں سے شروع ہوتی ہے پھر آگے چل کر غم دوراں کو بھی ساتھ لے لیتی ہے لیکن غم جاناں سے وہ کبھی کنارہ کشی نہیں کرتی بلکہ اس کا حال اس عورت کی طرح نظر آتا ہے جو کچھ دور تک تو اپنے دو بچوں کو گود میں لے کر چلتی ہے پھر کبھی ایک بچے کو گود میں رکھتی ہے اور دوسرے کو زمین پر چلاتی ہے۔ کبھی دوسرے کو گود میں لیتی ہے تو پہلے کو چلاتی ہے۔ لیکن اس کی محبت کسی سے کم نہیں ہوتی ـــ یہی حال فیض کا ہے ـــ وہ رومان سے سیاست کی طرف ضرور آئے لیکن رومان سے کبھی کنارہ کشی یا بے تعلقی اختیار نہیں کر سکے۔ انھوں نے اپنے بارے میں بالکل درست کہا ہے:

ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا تھا
اور عشق سے کام الجھتا تھا
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا[۵] (۱۹۷۶ء)

---

۵ شام شہر یاراں ص ۲۷

نقشِ فریادی کی عام طور سے تمام نظمیں مختصر ہیں، سادہ مگر پرکار ہیں، سچی بھی ہیں اور اچھی بھی۔ اُن میں ایک خاص نغمگی بھی ہے، دھیماپن بھی ہے، کرب بھی ہے، درد بھی ہے، کیف بھی ہے اثر بھی ہے اس لیے اکثر زبان زدِ خاص عام بھی ہیں۔ فیض کی نظموں کی مقبولیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ عام طور سے ان میں غزل کے اثرات غالب ہیں جس نے ان کی نظموں کو ایک خاص قسم کے سوز وگداز سے نکھار دیا ہے۔

نقشِ فریادی کو اگر مجموعی طور سے دیکھا جائے تو خاص طور سے "سرودِ شبانہ"، "میری جاں اب بھی اپنا حسن"، "انتظار تہہ نجوم"، "ایک رہگذر"، "میرے ندیم"، "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"، "سوچ"، "رقیب سے"، "تنہائی"، "چند روز اور مری جاں"، "کتے"، "اقبال"، "موضوعِ سخن"، "میرے ہمدم میرے دوست" وغیرہ اچھی نظمیں ہیں، جن کی مدد سے فیض کو پہچاننے میں اور ان کی فکر کی سمتوں تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں لیکن بہت زیادہ نہیں کل تیرہ[۱۳] ہیں جو حسب ذیل ہیں:

حسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز

عشق منت کشِ قرار نہیں
حسن مجبورِ انتظار نہیں

ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

وہ عہدِ غم کی کاہشہائے بے حاصل کو کیا سمجھے
جو اُن کی مختصر روداد بھی صبر آزما سمجھے

ہمتِ التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی

چشمِ میگوں ذرا اِدھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اسقدر بھی نہیں

رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

یہ عجیب بات ہے کہ فیض کی نظموں پر غزل کا گہرا اثر ہے لیکن وہ اپنی غزلوں میں وہ بانکپن، وہ کج ادائی، وہ کج کلاہی، وہ سوز و گداز، وہ درد و کرب، وہ اضطراب نہیں پیش کر سکے جو غزل کی پہچان قرار دیئے گئے ہیں۔ اُن کی غزلیں پڑھتے جائیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ریگ زار سے گذر رہے ہیں، سپاٹ اشعار، نہ درد نہ کرب، نہ کسک نہ تڑپ، نہ نغمگی نہ دلگدازی، نہ دلفگاری، بس برابر وزن کے مصرعے ترتیب دیے گئے ہیں خیالات بھی یونہی سے نہ فکر کیے گئے ہیں نہ فکر انگیز بن سکے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے شاعر کی غزلیں ہیں جو یا تو مبتدی ہے یا غزل کا شاعر نہیں ہے۔ حق بات یہ ہے کہ ان غزلوں کو پڑھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ فیض سے نہیں ان کی غزلوں سے۔ وہ شاعر جس کی نظموں میں غزل کا رنگ، آہنگ، اور غزل کی گرمی اور نرمی، غزل کا سوز و گداز اور غزل کی سرشاری اور اشکباری پائی جاتی ہے اس کی غزلیں اس قدر پھیکی اور بے مزہ ہو کر کیوں رہ گئی ہیں۔ کوئی بات تو ہو کہ قاری یا سامع کے دل و دماغ کچھ دیر متاثر رہیں۔ مجھے تو فیض کی غزلوں کے اس سرمایہ میں چند ہی شعر کچھ اچھے لگے۔ ملاحظہ کیجیے:

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی — مئے بہ اندازۂ خمار نہیں،

فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی — کیا ہوا گر وفا شعار نہیں
منتِ چارہ ساز کون کرے؟ — درد جب جاں نواز ہو جائے
اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ — میں نہیں یا وفا نہیں باقی
تیز ہے آج دردِ دل ساقی — تلخیِ مے کو تیز تر کر دے
جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی — چاک دامن کو تا جگر کر دے

یہ تو پہلے حصے کے چند اشعار ہیں دوسرے حصے کے بھی اشعار ملاحظہ کیجیے:

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں — تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن — دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حسن — گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں
نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں — اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں
نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو — وہ بے خبر ہی سہی، اتنے بے خبر بھی نہیں

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے — آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا
وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے — اُن کو اپنا بنا کے دیکھ لیا
آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے — سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں — پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے
پھر نکلا دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو — کچھ کہتی ہے ہر راہ، ہر ایک راہ گذر سے
وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا — اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِ نظر سے

یہ اشعار غنیمت ہیں اور غزل کے تقاضے کسی حد تک پورا کرتے ہیں اس لیے نظرِ انتخاب ان پر پڑتی ہے اس مجموعہ کی آخری غزل بہت اچھی ہے اگرچہ اس کی زمین نئی نہیں ہے:

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

فیض نے اس مدت میں بہت کم غزلیں کہی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ غزلیں وہ کیف پیدا نہیں کرتی ہیں جو اُن کی نظمیں پیدا کرتی ہیں۔ فیض پر رومان کا اثر غالب رہا ہے وہ اپنی نظم گوئی میں کبھی بھی اس سے دامن نہیں چھڑا سکے لیکن یہ بات حیرت کی ہے کہ وہ ایسی غزلیں نہیں کہہ سکے جیسی اُن سے ان

حالات میں امید کی جاتی تھی۔

فیض نے قطعات بھی قلمبند کیے ہیں لیکن زیادہ نہیں چند ہی کہہ سکے جن میں فیض کی کوئی چھاپ نہیں ہے نہ کوئی خاص بات ہے، البتہ ذیل کا قطعہ بہت پسند کیا گیا، جس میں تشبیہہ کی ندرت نے جان پیدا کر دی ہے ملاحظہ کیجیے:

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہہ قرار آ جائے

وہی حُسن و عشق، وہی تنہائی، وہی انتظار، وہی اضطراب، جو فیض کی نظم گوئی کی پہچان ہے لیکن تشبیہات نے بڑی جان پیدا کر دی ہے۔

مجموعی طور سے اس دور کی شاعری میں فیض کی نظموں کو اہمیت حاصل ہے جو غم جاناں سے شروع ہو کر غم دوراں تک پھیل گئی ہیں، جن میں زبان کی سادگی بھی ہے، نیا پن بھی، روانی بھی ہے اور خواب ناکی بھی غنائی کی بھی ہے اور نشریت بھی نغمہ کی لطافت بھی ہے، جذبہ کی صداقت بھی، سچائی بھی ہے خلوص بھی، جن کی وجہہ سے ان کی نظمیں مشہور بھی ہوئیں مقبول بھی اور جن کی وجہہ سے فیض دس بارہ سال کی مختصر مدت میں (۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۱ء تک) اردو شعراء میں اپنا ایک مخصوص لہجہ اور درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں:

(فیض احمد فیض نمبر۔ فن اور شخصیت بمبئی جون ۱۹۸۱ء)

ایک منفرد غزل گو

(مجروح سلطانپوری)

"ترقی پسند غزل گویوں میں سوا فیض کے کوئی ایسا نہیں ہے جس نے غزل کی خوبی یا خصوصیت میں کوئی قابل لحاظ اضافہ کیا ہو ان غزل گویوں کے کلام میں اشتراکی تصورات کی کار فرمائی ملتی ہے۔ جہاں کہیں، یہ غزل کے آداب سے انحراف کرتے ہیں۔ مضحکہ حد تک بے سُرے ہو جاتے ہیں۔ یہ بات سب سے زیادہ مجروح کے یہاں ملتی ہے یوں مجروح کی غزلیں بڑی دل آویز ہوتی ہیں اور ایک زمانے میں مجھے اس خیال سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ آگے چل کے غزل گویوں میں وہ اپنے لیے بڑا اونچا مقام پیدا کریںگے لیکن ترقی پسند حلقہ میں پہنچکر وہ غالب کے اس شعر کو فراموش کر گئے:

پیمانہ بر آں رند حرام است کہ غالب
در بے خودی اندازۂ گفتار نہ داند

مجھے اندیشہ ہے کہ وہ جلد نہ سنبھلے تو کہیں ان کا حشر وہی نہ ہو جو یاس چنگیزی کا ہوا"[1]

یہ خیالات رشید احمد صدیقی نے اس وقت ظاہر کیے ہیں جب مجروح سلطانپوری غالباً ۱۹۴۱ء میں تقریباً بائیس تیئیس ۲۲-۲۳ سال کی عمر سے شعر و شاعری کر کے اور نظم گوئی کو منہ لگا کر اس صنف سے کچھ کچھ بیزار ہو چکے تھے اور غزل کی زلف میں اسیر ادر

---

[1] جدید اردو غزل: رشید احمد صدیقی فکر و نظر علی گڑھ جلد ا ۱۹۵۴ء ص ۴۷

اس کے مجوبانہ انداز سے سرشار ہوکر بالکل اسی کے ہو رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی پینتیس ۳۵ سال کی فکری اور شعری دولت بنام "غزل" ۱۹۵۲ء میں پیش کر چکے تھے۔

اس دوران میں مجروح سلطانپوری کی زندگی میں تین نہایت اہم شخصیتیں آئیں، جنھوں نے ان کی شاعری اور اندازِ فکر کو سنوارنے، نکھارنے اور خوب سے خوب تر بنانے میں دانستہ یا نادانستہ بڑے اہم فرائض انجام دیے۔ پہلی شخصیت آسی الدنی کی ہے دوسری رشید احمد صدیقی کی، اور تیسری جگر مرادآبادی کی۔

مجروح سلطانپوری نے آسی مرحوم کو پہلا استاد قرار دیا اور یکے بعد دیگرے دو غزلیں ان کی اصلاح کے لیے پیش کیں — استاد نے استادانہ انداز دکھائے، الفاظ بدل دیے، خیالات تبدیل کر دیے، چنانچہ اشعار تو بن سنور گئے لیکن اس نوجوان شاعر کو کچھ جھٹکا لگا، اپنا اعتماد بکھرتا ہوا دکھائی دیا، اس لیے وہ استاد اور شاگردی کے اس رشتے سے بدک گئے جس میں اپنی پہچان باقی نہ رہے اور پھر اپنی خوبیوں، خامیوں کے ساتھ اپنی ڈگر پر تن تنہا چل پڑے، اچھا، بُرا جو کچھ کہتے اسی کو اپنی شاعری کا سرمایہ متصور کرتے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں حذف و اصلاح بھی کرتے جاتے۔ مجروح کی زندگی کا یہ پہلا لیکن نہایت اہم فیصلہ تھا۔

دوسری اہم شخصیت پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تھی، جنھوں نے مجروح کو ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ بلایا تاکہ وہاں کے ماحول اور کتب خانے سے علمی اور ادبی فیض حاصل کرنے کا موقع ملے جس نے انھیں کیا سے کیا بننے میں بڑی مدد کی۔

اور تیسری محترم شخصیت حضرت جگر مرادآبادی کی تھی جنھوں نے مجروح کے کلام پر اصلاح کبھی نہیں کی لیکن استاد سے بڑھ کر اُن کی ذہنی تربیت سے دلچسپی لیتے رہے اور مختلف انداز سے رہنمائی کرتے رہے چنانچہ اُن کی شفقت، محبت، دلچسپی اور گہرے تعلق کا آج بھی مجروح نہایت والہانہ انداز سے اعتراف کرتے ہیں اور ان سے متعلق مختلف قسم کے واقعات سناتے ہیں۔

انھیں حضرات کے، ہلکے گہرے اور دیرپا نقوش کے ساتھ خود ان کی فکر شعر گوئی، غمِ دوراں غمِ جاناں، سے تپتی پگھلتی، ڈھلتی اور نکھرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔

کبھی غم دوراں کی ترجمانی کی تو وقت اور اس کے تقاضوں سے ہم عصروں کو آگاہ کیا اور زلف گیتی کے سنوارنے کی سعی کی، اور کبھی گیسوئے محبوب کے خیال میں کھو گئے تو ایسی غزل چھیڑ دی کہ سب چونک پڑے، اس لیے کہ آواز بھی نئی محسوس ہوئی اور خیالات بھی مختلف نظر آئے۔

لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مجروح سلطانپوری نے جب شاعری شروع کی تو ابتدا نظم گوئی سے ہوئی تھی، کچھ مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر غزل کی طرف متوجہ ہوئے تو نظم گوئی سے دلچسپی کم ہونے لگی، شاید انھیں احساس ہوا کہ نظم کے میدان میں کچھ اضافہ نہ کر سکیں گے۔ اس لیے غزل کو ہی اپنے احساسات، جذبات اور افکار کا ذریعہ بنایا۔

مجروح سلطانپوری کی ۱۹۴۵ء میں ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود نظم گوئی سے بے تعلقی اور معتوب صنف غزل سے گہری وابستگی کا فیصلہ ان کی آئندہ زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس لیے کہ مجروح جس عہد کی پیداوار ہیں اس میں حالی اور اقبال کی وجہ سے اردو ادب کے ایوان میں نظم گوئی بلند مرتبہ ہو چکی تھی اور اس کے برخلاف خاص طور سے ترقی پسندوں میں اردو غزل سبک بنی ہوئی تھی، اس کے خلاف الزامات تراشے جا رہے تھے اور فتوے سنائے جا رہے تھے جگر مرادآبادی جیسے غزل گو حالات اور ماحول سے متاثر ہو کر یہ کہنے لگے تھے:

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

ایسے غزل دشمن ماحول میں مجروح نظم گوئی سے بے تعلقی اختیار کرتے ہیں اور غزل کے حضور میں اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں ــــ اس وقت یہ فیصلہ بڑی ہمت چاہتا تھا، مجروح سلطانپوری ہمت کر گئے اور بازی مار گئے۔ انھوں نے غزل کا اعتبار قائم کیا اور اعتماد حاصل کیا۔ انھوں نے قائل کیا کہ غزل محض حسن و عشق کے فرسودہ جذبات اور احساسات کی ترجمان نہیں ہے بلکہ عہد جدید کے مسائل، تقاضے اور ضروریات کے اظہار پر بغیر اپنے مزاج رنگ و آہنگ کے نقصان پہنچائے ہوئے قدرت رکھتی ہے۔ مجروح سلطانپوری اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ بہت سے دوسروں نے بھی ان سے اتفاق کیا اور اس راہ

پر ہو لیے —— غزل سُرخ رو ہوئی اور ایک بار پھر کھوئی ہوئی مقبولیت کی دولت سے مالامال ہوئی۔

لیکن مجروح سلطانپوری کو اس منزل پر پہنچنے میں وقت لگا، انھیں تجربوں سے گذرنا پڑا، تب جاکر وہ غزل اس کی خو، بو، فکر و خیال، رعنائی و جمال اور سوز و گداز کے ساتھ، پیش کرنے میں کامیاب ہوئے، البتہ کبھی کبھی ناکام بھی رہے —— یہی وجہ ہے کہ ان کا مجموعہ کلام "غزل" کے مختلف اڈیشنوں میں حذف، اصلاح اور اضافہ کا عمل برابر جاری رہا ہے۔

مجروح سلطانپوری کی زندگی میں ۱۹۴۵ء اس لیے اہم ہے کہ وہ اسی سنہ میں عروس البلاد بمبئی تشریف لے گئے تھے، اسی زمانہ میں فلم سے ان کا تعلق پیدا ہوا تھا اور اسی دور میں وہ ترقی پسند ادب سے وابستہ ہوئے تھے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ۱۹۴۵ء نے ان کی زندگی کو نئے نئے تجربات سے ہمکنار کرنے، اور نئے نئے فیصلے سنانے میں مدد کی تو درست ہوگا۔ اسی کے بعد سے وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ عملی سیاست سے بھی قریب ہوئے چنانچہ اس کا اثر ان کی غزلوں پر بھی پڑا اس تحریک سے وابستہ ہونے سے پہلے ۱۹۴۴ء تک ان کی جو غزلیں مطبوعہ صورت میں دستیاب ہیں وہ کُل چار ہیں۔ اگرچہ اس بات پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس وقت تک انھوں نے اس قدر کم غزلیں کہی ہونگی —— ہاں یہ ممکن ہے کہ انھوں نے نہایت سخت انتخاب کیا ہے۔ بہرحال وہ غزلیں یہ ہیں:

کب تک مَلوں جبیں سے اُس سنگ در کو میں	۱۹۴۱ء
پندار تمنا ٹوٹ کے بھی دل کا کوئی عالم کیا ہو گا	۱۹۴۳ء
یہ رُکے رُکے سے آنسو یہ دبی دبی سی آہیں	۱۹۴۴ء
مسرتوں کو یہ اہل ہوس نہ کھو دیتے	۱۹۴۴ء

یہ بات بھی سچ ہے کہ یہ غزلیں ایسی نہیں ہیں کہ اپنی طرف کسی خاص سبب سے متوجہ کرلیں، وہی جذباتِ عشق، وہی تغافل دوست کے شکوے، جبین عاشق اور سنگ آستاں، عالم رخصت، رُکے رُکے سے آنسو، دبی دبی آہیں، گیسوؤں کے سائے، سرشکِ غم اور زخمِ تمنا کھانے کی بات البتہ اِن میں ایسے اشعار بھی

ملتے ہیں جن میں اگر خیالات بالکل نئے نہیں لیکن مجروح کی شاعری کی سمت طے کرنے میں مدد کرتے ہیں اور یہ انداز ہونے لگتا ہے کہ وہ غمِ جاناں کی زبان میں غمِ دوراں سے بھی باخبر کرنا چاہتے ہیں۔

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاشِ دستِ رہبر
کہیں جگمگا اٹھیں ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

یا۔ بچالیا مجھے طوفان کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

یہ اشعار ۱۹۴۴ء یعنی ترقی پسند تحریک سے وابستگی سے پہلے کے ہیں۔ بعد میں ان کے یہاں ترقی پسندانہ خیالات میں شدّت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ۱۹۵۱ء میں قید کرلیے جاتے ہیں۔ یہ زمانہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک چھ سال پر محیط ہے۔ اس زمانے کی مطبوعہ غزلیں جو ان کے مجموعہ کلام "غزل" میں ملتی ہیں وہ کل تیرہ[۱۳] ہیں، یہاں بھی مجروح نے بڑی سختی سے انتخاب کیا ہے اسی لیے اس مدت میں اس حد تک کم غزلیں ملتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مجروح سلطانپوری کا تعلق فلم سے بھی ہوگیا تھا اور ہندستان کی جنگ آزادی فاتحانہ اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی اور انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں لوٹ کر چکنا چور ہوگئی تھیں۔ سارا ہندستان آزادی کی نعمت پاکر رقص کرنے لگتا ہے اور آزادی کے ترانے میں محو ہوجاتا ہے۔ اس رقص و سرود میں ہر طبقہ اور ہر مذہب و ملت اور خطہ اور ہر پیشہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ ادب نے جہاں حصول آزادی کی آنچ کو تیز کیا وہاں آزاد ہندستان میں خوشی اور مسرت کے نغموں کے پھول برسائے چنانچہ ایسے ہی زمانے کی مجروح سلطانپوری کی غزلوں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو جہاں "نگاہ ساقی نامہرباں کی شکایت" "حیات کو لغزش پیہم کا نام دینا"، "محبوب کا صبح عارض پر لیے زلفوں کی شام آنا" "چراغ راہ کا جلنا"، "چہرے پر زلف کا اڑنا"، "شبنوں کے راز کا مچلنا"، "نگاہ یار کا برسوں سے افسانہ کہنا"، اور "پائے جاناں پر سجدے کرنا" وغیرہ کی تصویریں آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہیں وہاں دلکش آوازیں سنائی دیتی ہیں اور رنگارنگ کیفیتوں سے دل لطف اندوز ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پسندیدہ نئی آواز کانوں سے دل میں اتر رہی ہے، زبان سادہ، انداز دلنشیں، خیالات پاکیزہ،

موضوعات پسندیدہ ملاحظہ کیجیے :

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

ملی جب اُن سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں
ہٹی جو آنکھ تو چاروں طرف ویرانے

اس نظر کے اٹھنے میں، اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ، ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ بھی جل گئے

منتظر ہیں پھر میرے حادثے زمانے کے
پھر مرا جنوں، تیری بزم میں غزلخواں ہے

سوال ان کا جواب ان کا سکوت ان کا خطاب ان کا
ہم ان کی انجمن میں سر نہ کرتے خم تو کیا کرتے

جنّت بہ نگہ، تسنیم بہ لب، انداز اس کے اے شیخ نہ پوچھ
میں جس سے محبت کرتا ہوں انساں ہے خیالی حور نہیں

لیکن ہمارے شاعر کی دنیا صرف رنگ و بو کی دنیا نہیں، اسے صرف حسن و عشق کی کہانی سے سروکار نہیں، بلکہ اسے اس دنیا کی بھی فکر پریشان رکھتی ہے جہاں گوشت و پوست کا انسان ہے اس کی دکھ بھری کہانیاں ہیں، ہزاروں مسائل سر اٹھاتے ہیں اور ہزاروں پریشانیاں منہ چڑاتی ہیں اور وہ ان سے مضطرب دکھائی دیتا ہے اور ان کا مداوا چاہتا ہے ملاحظہ کیجیے ایسے اشعار جن میں اس طرف اشارے ملتے ہیں :

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غم جاناں نہ برسوں سے

یہ دنیا میری روداد محبت سے نہ اکتائے
اسی روداد میں دنیا کے افسانے بھی آئیں گے

اور پھر جہانِ آب و گل کی، اس کے سود و زیاں کی، سیر کرتا ہے اور روشن مستقبل کے راستے بھی دکھاتا ہے، اسے ہموار کرنے کی باتیں بھی کرتا ہے اور عزم و حوصلہ کرنے کی سعی بھی کرتا ہے :

ہم قفس صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آ ہی گیا

پستی زمیں سے ہے رفعت فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کجکلاہی بھی

ڈرا کے موج و تلاطم سے ہم نشینوں کو
یہی تو ہیں جو ڈبویا کیے سفینوں کو

یہ محفل اہل دل ہے یہاں ہم سب میکش ہم سب ساقی
تفریق کریں انسانوں میں اس بزم کا یہ دستور نہیں

سنتے ہیں کہ کانٹوں سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر عزم جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

یہ اشعار خیالات کی تازگی اور ندرت فکر کی وجہ سے مجروح کی غزل گوئی کی پہچان بن جاتے ہیں اور اہل نظر سے تعریف و تحسین کے خراج لینے لگتے ہیں۔

آزادی حاصل کرنے کے تقریباً ڈیڑھ دو سال بعد جب آزادی کی نعمتیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور اس کی برکتیں ظاہر ہوتی ہیں تو مجروح اپنے تاثرات اس نظم نما غزل میں اس طرح پیش کرتے ہیں :

عہد انقلاب آیا دور آفتاب آیا — منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے
اب زمین گائے گی ہل کے ساز پر نغمے — وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
اہل دل اگائیں گے خاک سے مہ و انجم — اب گہر سبک ہوگا جو کے ایک دانے سے
منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن — اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے
عام ہوگا اب ہمدم سب پہ فیض فطرت کا — بھر سکیں گے اب دامن ہم بھی اس خزانے سے
میں کہ ایک محنت کش، میں کہ تیرگی دشمن — صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے

لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ ہمارے شاعر مجروح سلطانپوری کو مایوسی ہوتی ہے ۔ دراصل ہماری آزادی وہ سحر ثابت نہیں ہوتی جس کے سب منتظر تھے، چنانچہ حالات سے مجبور ہوکر وہ ادب کی قلمرو سے نکل پڑے اور سیاست کی حکمرانی کو اپنے اوپر مسلط کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ یہ باتیں میں ۱۹۵۰ء کی کر رہا ہوں، ہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مجروح سلطانپوری کے مجموعہ کلام کے وہ اوراق جو ۱۹۵۰ء کے لیے مخصوص تھے سادہ رہ گئے البتہ ان کا وہ کلام فضا میں گونجنے لگا جو خالص سیاسی تھا لیکن ایوان ادب میں اسے باریابی کی اجازت کبھی نہیں ملی ۔ ملاحظہ کیجیے :

ع لال پھریرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا

اور ع یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

کچھ دنوں تک مشاعرے کی فضا ان کے اس طرح کے کلام سے بوجھل رہی اور ان کے ہم زبان، ہم خیال اور ان کی تحریک سے متاثر شعرا نے اس طرح کے کلام کو پسند بھی کیا اور تاثر بھی قبول کیا لیکن ادب کے ایوان میں ایسے کلام کو ممنوع قرار دیا گیا اور مخالفت میں فتوے صادر ہونے لگے ۔ ادھر حکمران جماعت کی پیشانی پر بل پڑنے لگے اور اس کی نگاہ مجروح سلطانپوری کا تعاقب کرنے لگی، چنانچہ ایک وقت ایسا آیا جب مجروح کو قید و بند کی زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ وہ ۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء میں گرفتار کر لیے گئے اور بمبئی کے ارتھر جیل میں ڈال دیے گئے ۔ جہاں تقریباً ایک سال تک

رہنا پڑا۔ مندرجہ ذیل چھ غزلیں اسی قید کی زندگی کی یادگار ہیں:

دستِ منعم میری محنت کا خریدار سہی — کوئی دن اور رہیں رسوا سرِ بازار سہی

ہوں جو سارے دست و پا ہیں خوں میں نہلائے ہوئے — ہم بھی ہیں اے دل بہاراں کی قسم کھائے ہوئے

جس دم یہ سنا، ہے صبحِ وطن محبوس فضائے زنداں میں — جیسے کہ صبا اے ہم قفسو، بیتاب ہم آئے زنداں میں

دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ — ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

میرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرمِ سفر نہ ہو — کہ نہیں مرا کوئی نقشِ پا، جو چراغِ راہ گذر نہ ہو

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے — قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

جو اُردو ادب کے لیے "ارمغانِ زنداں" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا مطالعہ اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ اردو شاعری کے سرمایہ میں اس طرح کے تحفے بہت زیادہ نہیں ہیں۔

یہ غزلیں اگرچہ موضوع کے اعتبار سے غمِ دوراں ہی نہیں بلکہ شاعر کی سیاسی زندگی کے زخمِ پنہاں بھی دکھاتی ہیں اور کاروبارِ عشق کے بجائے کاروبارِ سیاست پر روشنی ڈالتی ہیں۔ لیکن ان میں غزل کی زبان کی، نرمی، شیرینی، روانی اور شگفتگی کے ساتھ اس کے مزاج اور اس کی کیفیت میں کہیں بھی اور کسی قسم کی بھی کمی پیدا نہیں ہوتی ہے حالانکہ موضوع کا تقاضہ تھا کہ اس کے مزاج کو نقصان پہنچتا:

میں نے دیکھی ہے اسی میں غمِ دوراں کی جھلک — بے خبر رنگِ جہاں سے نگہِ یار سہی،

زندگی کی قدر سیکھی، شکریہ، تیغِ ستم — ہاں ہمیں تھے کل تلک جینے سے اکتائے ہوئے

غیروں کی خلش، اپنوں کی لگن، سوزِ غمِ جاناں، دردِ وطن — کیا کہیے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ — اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

مرے ہاتھ ہیں تو بنوں گا خود میں اب اپنا ساقیِ میکدہ — خمِ غیر سے تو خدا کرے لبِ جام بھی مرا تر نہ ہو

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے — میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی — یہ رسمِ قید و زنداں، ایک دیوارِ کہن تک ہے

دعائیں دے رہے ہیں راستے مجھ آبلہ پا کو — میرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

جیل سے رہا ہونے کے بعد کی غزلیں "غزل" کے چوتھے اڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۶ء میں شامل ہیں، ان میں دو غزلیں ۱۹۵۲ء کی ہیں اور تین غزلیں ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۹ء کی

ہیں یعنی اس زمانے کی کل حسب ذیل پانچ غزلیں ملتی ہیں:

(۱۹۵۷ء)

جلوۂ گل کا سبب دیدۂ تر ہے کہ نہیں میری آہوں سے بہاراں کی سحر ہے کہ نہیں

شمع زنداں، مجھے ہو گلبدن سرخ ترا میں تو دیوانہ ہوں اے انجمن سرخ ترا

ہندوستان کا دروازہ عوامی چین کی طرف کھلتے ہوئے دیکھ کر:

(۱۹۵۸ء)

آہی جائے گی سحر مطلع امکاں تو کھلا ہم نوا قفل تو ٹوٹا در زنداں تو کھلا

ادائے طول سخن کیا وہ اختیار کرے جو عرض حال بطرز نگاہ یار کرے

ہمیں شعور جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے نگاہ بن کے حسینوں کی انجمن میں رہے

(اگست ۱۹۵۹ء)

مندرجہ بالا پانچ غزلوں میں ایک "نذر سوویت" ہے دوسری "ہندوستان کا دروازہ چین کی طرف کھلتے دیکھ کر" کہی گئی ہے۔ باقی تین پر کسی قسم کا اشارہ نہیں ملتا کہ کس وجہ سے کہی گئی ہیں "نذر سوویت" کے سلسلے میں تین شعر ایسے کہے گیے ہیں جو "سرخی" کے علاوہ کچھ نہیں بولتے۔ بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو سرخی ناپسند کرتے ہونگے مگر مجھے یہاں یہ "سرخی" سیاست کی ترجمان بن کر اپنی تمام تر رعنائی کھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دوسری غزل چین سے گہرے تعلق کی غمازی کرتی ہے۔ لیکن یہ غزل سیاست کی ترجمان ہونے کے باوجود اپنا حسن کھوتی نہیں اور تغزل کی نرم و نازک فضا کو برقرار رکھتی ہے:

سیل رنگ آہی رہیگا مگر اے کشت چمن ضرب موسم تو پڑی بند بہاراں تو کھلا

باقی تین غزلوں میں:

جگائیں ہم سفروں کو، اٹھائیں مشعل شوق نہ جانے کب ہو سحر کون انتظار کرے

مثال ملتی ہے کتنوں کو اس دوانے سے چمن سے دور جو بیٹھا غم بہار کرے

وہی ہے آبلہ پائی، وہی چمن بندی جیئے دوانہ ترا شہر میں یا بن میں جیئے

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے رہے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

وغیرہ ایسے اشعار ہیں جو مجروح سلطانپوری کی پہچان کراتے رہیں گے ان میں کاروبار غزل کی پوری ترجمانی ہوتی ہے لیکن ایک خاص کیفیت کے ساتھ۔

ان غزلوں کے علاوہ، اس کتاب کا پانچواں اڈیشن جب ستمبر ۱۹۷۰ء میں آیا تو

ساتھ نئی غزلوں کا تحفہ لے کر آیا۔ جن میں ایک خاص کیفیت ہے اور ان کے مطالعہ کے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ مجروح سلطانپوری ۱۹۷۰ء تک پہنچتے پہنچتے فکر و خیال اور اسلوب کے لحاظ سے اپنے فن کو ایک خاص معیار تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں ملاحظہ کیجیے:

کام آئے بہت لوگ سرِ مقتلِ ظلمات	اے روشنی کوچۂ دلدار کہاں ہے،
ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح	اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ	پھاڑے ہوں گے ہم نے عزیزو چار گریباں تم سے زیادہ
جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو	زخم کے مہر و ماہ سلامت جشنِ چراغاں تم سے زیادہ
بچ کے لائے ہم اے یار پھر بھی نقدِ وفا	اگرچہ لٹتے ہوئے رہزنوں کی ہات چلے

یہ اشعار اور اس طرح کے اور بھی اشعار ایسے ہیں جو غزل کا سوز و گداز سرمستی و بدمستی، حسن و جمال، دلکشی و دلداری، سرشاری و ہوشیاری اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں، ان کا اگر بھرپور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مجروح ٹمٹماتے ہوئے غزل کے چراغ کی لو کو نہ صرف تیز کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ اسے قبولیت عام حاصل کرانے میں آگے آگے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے مجموعہ کلام ”غزل“ کے نئے اڈیشن ستمبر ۱۹۷۰ء میں اس صنف کو اختیار کرنے کے سلسلے میں تحریر کیا ہے:

> میں نے صنفِ غزل کو اپنے لیے اس لحاظ سے بہتر جانا کہ اس کا ایک کامیاب شعر اپنے اختصار و دل نشینی کے باعث ابلاغ و ترسیل کی سہولتیں زیادہ رکھتا ہے“

یقیناً ان کے اشعار ان کے اس دعوی کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

(مجروح سلطانپوری نمبر۔ چراغ بمبئی)

قتیل شفائی

فروری ۱۹۶۱ء میں شاعر کی تیس سالہ اہم خدمات کے اعتراف کے اظہار کے لیے بمبئی میں جشن منایا گیا، جس میں دوسری تقریبات کے ساتھ انڈو پاک مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، شاعر کے مدیر محترم اعجاز صدیقی مرحوم نے شعراء کو لانے لے جانے کے انتظامات کرنے میں جن نوجوانوں کا انتخاب کیا تھا، ان میں میرا نام بھی تھا۔ قتیل شفائی سے پہلی ملاقات اسی مشاعرے کے سلسلے میں غالبًا سانتا کروز ہوائی اڈے پر ہوئی تھی، مل کر جی خوش ہوا دراز قد، گداز جسم، ناک نقشہ پسندیدہ شاعروں جیسا، اردو تہذیب اور مزاج کی نمائندگی کرتے نظر آئے علیک سلیک ہوئی تو محسوس ہوا کہ قدرت نے ایک اور دولت انھیں شیریں دہنی اور مزاج کی سادگی بھی عطا کی ہے۔ ادھر گفتگو شروع ہوئی اُدھر غیریت کا پردہ اٹھنے لگا اور پھر اپنائیت کی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی، اب نہ کوئی بڑا نہ چھوٹا، کوئی ملکی نہ غیر ملکی، ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم بہت پُرانے ملاقاتی ہیں، ہمارے درمیان سوائے پُر خلوص جذبات کے کوئی حائل نہیں رہا، خوب باتیں ہوئیں یہاں کی وہاں کی، ادب کی غیر ادب کی مشاعرے کی، محفل کی شاعروں کی نثر نگاروں کی، اچھوں کی بُروں کی یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ہم وہاں پہنچے جہاں قیام کا انتظام کیا گیا تھا، انھیں کمرے میں پہنچایا، سامان رکھوایا، خدا حافظ کہا اور رخصت ہوئے، پھر رات کو مشاعرے میں دور سے ان کا کلام سنا بڑا لطف آیا، دل میں قتیل شفائی کا احترام بڑھا، بحیثیت شاعر، بحیثیت انسان ــ آج تقریبًا بیس سال ہونے کو آئے ہیں ساری گفتگو ذہن کے پردے پر دھندلی پڑ گئی ہے۔ البتہ ایک جملہ بار بار یاد آرہا ہے انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان کے فلاں شاعر نے ان کے فلمی گیتوں کو اپنا ہی سرمایہ سمجھ کر جیسے جی چاہا اپنا

لیا ہے۔ یہ بات انھوں نے میرے علاوہ پروفیسر آدم شیخ سے بھی کہی تھی، اس ملاقات کے بعد پھر ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوئی، البتہ ان کا کلام ان کی یاد تازہ کرتا رہا اور لطف دیتا رہا۔ ہاں گذشتہ سال محب مکرم محمد طفیل صاحب نے جب اپنی خوبصورت کتاب "محبی" بھیجی تو ایک بار پھر قتیل شفائی سے ملاقات ہوئی طفیل صاحب نے نہایت دلنشیں انداز میں ان کی شخصیت کے مختلف دلچسپ پہلو، کچھ ظاہر کچھ ڈھکے چھپے گوشے اس کتاب کے چند اوراق پر پھیلا دیے ہیں، انھیں آنکھوں سے لگایا تو ان کی محبوب شخصیت نے ایک بار پھر متاثر کیا محمد طفیل کہتے ہیں:

"مجھے فارغ بخاری صاحب نے بتایا یا کسی اور نے کہ ایک زمانے میں کہ جب ان کی فاقہ مستی کے دن تھے، مقروض بھی تھے کہ فارغ صاحب ہری پور ہزارہ پہنچے، ادھر ان کی جیب خالی، قرض دینے والا بھی کوئی نہ تھا، خاصے پریشان ہوئے، انھوں نے دیکھا کہ چند روپے بھی کہیں سے میسر نہ آسکیں گے تو رسالوں کی فائلیں ردی میں بیچ دیں وہ رسالے جو انھوں نے بڑے چاؤ سے اکٹھے کر رکھے تھے ردی میں بک گئے، ذہن کی دنیا الٹ گئی دل کی دنیا آباد ہو گئی۔"[1]

مہمان نوازی کا یہ جذبہ جس میں اپنے کو مٹا کر بھی لطف اندوز ہوا جاتا ہے بڑا قیمتی بھی ہے اور نایاب بھی ہر کس و ناکس کے حصے میں یہ دولت کہاں سے آسکتی ہے۔ یہ تو کچھ قتیل جیسی شخصیتوں کے حصے کی چیز ہے جسے محبوب شخصیتوں کے لیے خاصے کی چیز کہا جائے تو بجا ہو گا۔ محمد طفیل ہی کی تحریر سے ان کی شگفتہ مزاجی کا بھی علم ہوتا ہے وہ بیان کرتے ہیں:

"چونکہ دوستی ہے اس لیے چہلیں یہ بھی کریںگے۔ فارغ بخاری صاحب باتھ روم میں جاتے ہیں تو خاصی دیر لگاتے ہیں چنانچہ ایک ایسے ہی موقع پر احمد ندیم قاسمی کی قتیل صاحب کے ساتھ مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی:

احمد ندیم قاسمی: فارغ صاحب غسل خانہ میں جاتے ہیں تو نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔
قتیل: وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ کیوں؟
وہ کام جس کا سب کو علم ہو وہ تو کرتے ہی ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ کرتے ہیں

---

[1] محبی از محمد طفیل ص ۱۳۸

"مثلاً مثلاً ! ۔

مثلاً وہ بالوں کو خضاب بھی غسل خانے ہی میں لگاتے ہیں۔

اتنے میں فارغ صاحب غسل خانے سے نکلے اور انھوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ قتیل تو ہر وقت میری برائیاں کرتا رہتا ہے باز آجا۔

قتیل صاحب نے کہا میں نے کوئی برائی نہیں کی"

فارغ: میں سب سن رہا تھا۔

قتیل: میں نے تو صرف بالوں کو خضاب لگانے کا ذکر کیا تھا، اصل بات تو بتائی ہی نہیں کہ تیرے سارے دانت مصنوعی ہیں[۵]"

یہ بھی معلوم ہوا کہ" اچھا کھانا ان کی کمزوری ہے۔ خود بھی کھاتے ہیں اور دوسروں کو کھلانے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ وہ اچھے پسندیدہ شاعر بھی ہیں گیت، نظم اور غزل سے انھیں ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گیت ان کی شخصیت میں زیادہ رس بس گیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ اکثر ان کی غزلیں اور نظمیں گیت سے متاثر نظر آتی ہیں شاید گیت سے اس تعلق ہی کی وجہ سے وہ آسانی سے فلمی دنیا میں داخل ہوئے اور بہت کم مدّت میں وہ قبولیت عام حاصل کی جو سب کے حصّے میں آسانی سے نہیں آتی، لیکن گیتوں سے ہٹ کر ان کی شخصیت بحیثیت نظم گو مسلّم ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کی شاعری میں حسن وعشق کی حقیقت پر ور فضا ملتی ہے جس کی وجہ سے وہ ایک خاص عمر کے نوجوانوں میں زیادہ مقبول رہے ہیں، اُن کی شاعری میں گہرا فلسفہ نہیں ملتا اور نہ ذہن و دماغ کو جھنجھوڑنے والی فکر کی ان کی شاعری سے توقع کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری پڑھنے کی چیز ہے، سننے سنانے کی چیز ہے۔ ان کی شاعری کی ایک خاص فضا ہے اس میں لازوال کیفیت ہے ان کے یہاں زبان و بیان کا جادو ہے۔ بعض غزلوں کے اشعار ملاحظہ کیجیے، محبت کی سرمستی و سرشاری اسی کو کہتے ہیں:

کسی کی نقرئی پازیب کی جھنکار کے صدقے مجھے سارا جہاں گاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

دل کو غم حیات گوارہ ہے ان دنوں پہلے جو درد تھا وہی چارہ ہے ان دنوں

---

[۵] مجتبیٰ از محمد طفیل ص ۱۳۵

کچھ ایسی دکھ بھری باتیں بھی ہوتی ہیں محبت میں
جنھیں محسوس کرتے ہیں مگر سمجھا نہیں سکتے

سنا ہے اک اجنبی منزل کو اٹھ رہے ہیں قدم
بُرا نہ مانو، تو رہنمائی کو میں سرِ رہ گذار آؤں

تھکا دیتی ہیں جب کونین کی پہنائیاں مجھ کو
ترے در پر پہنچکر تازگی محسوس کرتا ہوں

کچھ تو ہوں گی محبت کی مجبوریاں
کون سہتا ہے ورنہ کسی کے ستم

ذیل کے اشعار میں ذرا غم دوراں کی آواز بھی سنیے:

ملاحوں نے ساحلِ موجوں کی توہین تو کر دی
لیکن پھر بھی کوئی بھنور تک جانے کو تیار نہیں

قیدِ قفس کے بعد کریگا قیدِ گلستاں کون گوارہ
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں

اپنی تقدیر کو روتے رہے ساحل والے
جن کو آنا تھا وہ منجھدار تلک آ پہنچے ہیں

بھٹک رہا ہے زمانہ گھنے اندھیرے میں
وہ رات ہے جسے اندیشۂ سحر بھی نہیں

نہ جانے کون سی منزل کو لے چلے ہم کو
وہ ہمسفر جو حقیقت میں ہم سفر بھی نہیں

آ رہی ہے خود بخود شاید کوئی منزل قریب
مہرباں یوں قافلہ سالار پہلے تو نہ تھا

چمن والے خزاں کے نام پر گھبرا نہیں سکتے
کچھ ایسے پھول بھی کھلتے ہیں جو مرجھا نہیں سکتے

اے بادۂ ناب کے رکھوالے دو گھونٹ ادھر بھی پہنچا دے
معیارِ کرم اس محفل کا پیمانہ نام و نسب ہی سہی

چلو پابندیِ فریاد بھی ہم کو گوارہ ہے
مگر وہ گیت جو ہم مسکرا کر گا نہیں سکتے؟

کانٹا ہے وہ کہ جس نے چمن کو لہو دیا
خونِ بہار جس نے پیا ہے وہ پھول ہے

ذرا اس شعر کو بھی ملاحظہ کیجیے:

نویدِ موسمِ بہار، گل بہ گل، چمن بہ چمن
کہ جیسے عاشقوں کا ذکر وہ بھی گاؤں گاؤں

اس شعر سے بھی لطف اٹھائیے:

سوچ سمجھ کر دھوکا کھانا، پچھتانا پھر پیار نبھانا
پیار کی ہے یہ کون سی منزل اے غمِ جاناں اے غمِ دوراں

وہ غمِ دوراں سے بے تعلق ہو کر غمِ عشق میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے بلکہ:

دردِ عشق بھی مزے کی چیز ہے قتیل
گر غمِ حیات سے فراغ ملے

قتیل کے یہ اشعار بھی توجہ چاہتے ہیں

غمِ ذات سے مری زندگی غمِ کائنات میں ڈھل گئی
کسی بزمِ ناز میں کھو کے بھی مجھے کائنات سے پیار ہے

غمِ زمانہ، غمِ عاشقی، غمِ فردا
ہم اہلِ دل کے لیے ہیں ہزار تعزیریں

قتیل جن میں نہیں تھا غمِ حیات کا رنگ
مٹی مٹی نظر آتی ہیں اب وہ تحریریں

دیکھیے اس شعر میں کیسا تجربہ ہے :

لٹ کر سمجھ رہے ہیں کہ نادم ہیں راہزن　　کتنی حسین اہل مروّت کی بھول ہے

قتیل کی غزلوں کے مطالعہ کے بعد جب سردار جعفری کے یہ خیالات نظر سے گزرے :

"ترقی پسند ادب نے، نظموں کے ساتھ ساتھ غزل پر بھی اثر ڈالا ہے، اب انفرادی جذبات اور مجرّد تصورات کی جگہ اجتماعی جذبات اور سیاسی احساسات آرہے ہیں۔ سیاسی مسائل بھی غزل کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں، ایک طرف تو روایتی تشبیہوں اور استعاروں کا نیا اور شگفتہ استعمال ہے اور دوسری طرف نئے نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کی آمیزش ہے جو روزمرہ زندگی سے حاصل کی گئی ہے اس کوشش میں فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر، جذبی، حفیظ ہوشیارپوری اور مجروح سلطانپوری ہی نہیں جگر مرادآبادی بھی شریک ہیں" [۵۴]

تو بے انتہا حیرت ہوئی کہ ان سات شاعروں کا نام لے کر سردار جعفری رک کیوں گئے آٹھواں نام قتیل شفائی کا بھی لینا چاہیئے تھا اس لیے کہ ترقی پسند ادب جس قسم کی شاعری اور غزل گوئی کو اپنی میراث سمجھتا ہے اسی قسم کا کلام قتیل کے یہاں غزلوں میں نمایاں ملتا ہے۔

قتیل شفائی کی غزلوں میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے غزل کے مزاج اور آہنگ کو مجروح ہونے نہیں دیا، انھوں نے ہندی کے نئے الفاظ دیپ، اکاش، کونپل، رس، روپ، الاؤ، گھور اندھیرا، لاج، پنچھی وغیرہ کو غزل میں اس انداز سے کھپایا ہے کہ نہ تو وہ کہیں اجنبی محسوس ہوتے ہیں نہ ہی ان سے غزل کی لطافت کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کا حسن اور اس کی رعنائی ان کی نظموں میں بھی نمایاں ہے، زبان سادہ لیکن دل میں اُترنے والی ہے لہجہ میں نغمگی، سرمستی اور سرشاری، اسلوب میں شائستگی، لطافت، روانی اور برجستگی وغیرہ سب کچھ ہے۔ گیت نگاری سے بہت زیادہ رغبت

---

[۵۴] ترقی پسند ادب. بحوالہ غزل نمبر نقوش لاہور ص ۲۴۴

کی وجہ سے غزلوں کی طرح نظموں پر بھی گیت کے حسین سائے پڑتے محسوس ہوتے ہیں، وہ محبت کے پرستار ہیں، حُسن کسی رنگ میں ہو اس کے قدر داں ہیں، جمالِ یار سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ مضطرب بھی، دونوں صورت میں اُن کے احساسات اور جذبات حسین شعر میں ڈھل جاتے ہیں۔ لیکن کیسے شعر؟ نرم و نازک، گداز دلوں میں اترنے والے دماغ کو جھنجھوڑنے والے۔ ان کی نظمیں چاہے حُسن کی وادی میں پہنچائیں، یا کارزارِ حیات سے ہم کنار کریں ہر جگہ جادو جگاتی ہیں، اور صداقت پر مبنی حسین تاثر چھوڑتی ہیں، "دعا" کے دو بند ملاحظہ کیجیے:

گاؤں سے دور، کھیتوں کے اُس پار، وہ صاف و شفاف چشمہ اُبلتا رہے
شوخ پنہاریوں کا جمگھٹا گاگریں لے کے راہوں پہ چلتا رہے
حُسن منظر کے سانچوں میں ڈھلتا رہے

"وادی سربن کی ایک صبح" سے۔

ہو گئیں صاف شفاف پگڈنڈیاں، میلی میلی چٹانوں کے منہ دھل گئے
سوئی سوئی فضا آنکھ ملنے لگی، سیلی سیلی ہواؤں کے پر تل گئے
پیارے پیارے پرندے چہکتے ہوئے، آشیانوں سے اُڑ اُڑ کے آنے لگے
ننھے ننھے سے پَر، پھڑپھڑاتے ہوئے کوئی بے نام سا گیت گانے لگے

اب "کروٹ" کے مناظر کی سیر بھی کر لیجیے۔ نہایت فرحت بخش ہیں:

ننگے پیڑوں کو ڈھانپنے کے لیے
پھیلے جاتے ہیں ریشمی سائے
آ گئے وہ پیڑوں کو پھیلائے
غول کے غول سبز پریوں کے

ایک کروٹ سی اور خزاں ناپید
ایک آہٹ سی اور موسمِ گل
خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر
چھا گیا ہے ترانۂ بلبل ——

ابر جھوما تو رند بھی جھومے

جامِ رقصاں ہے مے چھلکتی ہے

قہقہے سن کے موسمِ گل کے

دور ریت جھرو کہیں سسکتی ہے

یہ دنیا کے تلخ تجربات تھے جنھوں نے قتیل شفائی سے "ردِ عمل" جیسی نظم لکھوائی، جس میں طنز بھی ہے حقیقت بھی ہے اور تلخی بھی:

اے گداگر! مجھے ایمان کی سوغات نہ دے

مجھ کو ایمان سے اب کوئی سروکار نہیں

میں نے دیکھا ہے ان آنکھوں سے مروت کا مآل

مجھ کو اب مہر و محبت سے کوئی سروکار نہیں

میں نے انسان کو چاہا بھی تو کیا پایا ہے

اب مرا کفر خدا کا بھی طلب گار نہیں

"میرا قلم" میں اپنے زمانے کے مسائل کی جلوہ گری کی گئی ہے اور بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ:

مرے قلم سے تقاضہ ہے شہریاروں کا

کہ اس کے لب پہ رہے تذکرہ بہاروں کا

اگر کہیں نظر آئیں سلگتے ویرانے

قرار دیں انھیں ہم سر گلاب زاروں کا

اگر زمیں پہ بلکتے ہوں خاک کے ذرے

گماں ہوا ان پہ دمکتے ہوئے ستاروں کا

اگر شباب کے نوحے فضا میں رچنے لگیں

مذاق اڑائے زمانہ ستم کے ماروں کا

اگر کوئی سر بازار بھوک سے تڑپے

سنائے ان کو فسانہ خدا کے پیاروں کا

طنزیہ اسلوب کے ساتھ یہ نظم عروج کو پہنچتی ہے۔ آخری بند اس کا ملاحظہ کیجیے اور قتیل کے احساس فرائض کو سمجھنے کی کوشش کیجیے:

میرا قلم میرے جمہور کی امانت ہے
اسے عوام کی بے چارگی ستاتی ہے
میرے قلم کی زباں کاٹ دی گئی لیکن
میرے قلم کی خموشی بھی گنگناتی ہے
مرے قلم کے رگوں میں وہ خون جولاں ہے
کہ جس سے عظمتِ انساں کی آنچ آتی ہے
مرا قلم وہ مورخ ہے جس کے سینے میں
غمِ حیات کی تاریخ سر سراتی ہے
مرے قلم کو زمانہ تو کیا خریدے گا
کہ اکثر اس سے مشیت شکست کھاتی ہے
میں خود اسیر سہی میرا فن اسیر نہیں
مرا قلم کسی جلاّد کا ضمیر نہیں

لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ مجھ سے اتفاق کرینگے کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ عورتوں کے احساسات جذبات اور مسائل سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اس حسن کی پیکر کی محبت میں سرشار بھی نظر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ناروا سلوک سے مضطرب بھی اور خود اس کی فطری کمزوریوں اور حالات سے مجبور ہو کر بے راہ رویوں سے بے چین بھی ہو جاتے ہیں۔ ایکٹریس، راستے کا پھول، البم، بانجھ، کھلونا، آئینے کے سامنے راکھ، آج کی باتیں، کل کے سپنے، ایسی ہی نظمیں ہیں جن کے موضوعات کچھ اسی قسم کے ہیں، شکوہ شکایت مجبوریاں، خود غرضیاں، سچائیاں ہوسناکیاں وہ انھیں حالات سے دوچار ہوتے ہیں اور مچلتے بدکتے کڑھتے تاسف کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی عورت کے جذبات کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں؛

دیکھ کر کٹیا میں مجھ کو کروٹیں لیتے ہوئے
غرق ہو جاتے ہیں احساسات گہری سوچ میں
رینگتی ہے دل کے اک تاریک گوشے میں امید
آرہے ہوں جیسے وہ مجھ کو صدا دیتے ہوئے

جن کے پس منظر میں میری جنتیں آباد تھیں
مسکراتے ہیں ابھی تک دریچوں کے کواڑ
جیسے میری زندگی بازیچۂ زنجیر ہے
جیسے میرے جھونپڑے کا کوئی مستقبل نہیں

میرا ننھا ہے کہ فردوسِ بریں کا پھول ہے
رات کی تنہائیوں میں دے کے اس کو لوریاں
"لو وہ ابا آ گئے"، کہتی ہوں جانے کس لیے
وہ نہ آئینگے، نہ آئینگے یہ میری بھول ہے (کھنڈر)

یا یہ احساسات بھی قابلِ غور ہیں:

رہی نہ سانس میں خوشبو تو بھاگ پھوٹ گئے
گیا شباب تو اپنے پرائے چھوٹ گئے
کوئی مجھ کو چھوڑ گئے کوئی مجھ کو لوٹ گئے
محل گرے سو گرے جھونپڑے بھی ٹوٹ گئے (شمع انجمن)
رہا نہ کوئی ٹھکانہ

نظموں میں ان کے ہیئت کے تجربے بھی ملتے ہیں جن کی مدد سے وہ تاثیر اور کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

جاگ سہیلی
جاگ سنبھل کر آنکھیں مل کر
ادا البیلی
ہوا سویرا (دلہن)

یا: اُڑا اُڑا سا رنگ ہے
وہ آ رہی ہے جس طرح کٹی ہوئی پتنگ ہے
نڈھال انگ انگ ہے

[قتیل نمبر۔ فن اور شخصیت۔ مارچ ۱۹۸۲ء]